Intellectual Youth
2010

انٹلیکچوئل یوتھ
2010

STUDIES

P.U.PRESS

”پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے
پیدا کیا۔ پڑھ کہ تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا
اور انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔“

القرآن(96:1-5)

حسنِ ترتیب

1	اداریہ	iii
2	پیش لفظ	iv
3	مدیر کا پیغام	vi
4	نائب مدیران کے پیغامات	vii

مضامین

3	صنف (Gender) ایک تعارف	1
4	اسلام اور خواتین۔۔۔ایک سماجی مطالعہ	3
5	مسلمانوں پہ دہشت گردی کا الزام کیوں؟	6
6	آج کا انسان اور اسکا مستقبل	9
7	قائد اور آج کا نوجوان	11
8	ڈپریشن۔۔۔امراض کا پیش خیمہ	14

تخلیقات

قصّہ کہانی

9	کہانی کار	17
10	رشتوں کی الجھن	18
11	ناکام	21

سخن وری

12	ایک خانہ بدوش لڑکی کا المیہ	23
13	یونیورسٹی کا ایک بینچ	25
14	خود کلامی	27
15	جانِ حیات	28

16	تیری آنکھیں	30
17	لڑکی کا لمحہ	30
18	ہم ایسے، ہی ہیں	32
19	خواہش	33
20	چھوٹی سی بات	33

شاعری سے انتخاب

21	کیمپس میں ایک شام	35
22	آج	36
23	ہیں جو الجھے ہوئے دامن سے میرے خار سے کچھ	37
24	رقیب سے	38
25	بندھن	40

اقتباسات

26	رزق	41
27	عجیب بات	41

طنز و مزاح

29	کچھ شہنشاہِ غزل کے بارے میں	43
30	کیفے ٹیریا	44
31	اشتہار ضرورت رشتہ	46

اداریہ

دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو لفظ کی حرمت کو اس کے پورے معنی کے ساتھ سمجھتے ہیں۔لفظ مقدّس بھی ہوتے ہیں اور لفظ آئینہ بھی۔آپ اپنی بات کے لیے جن لفظوں کا انتخاب کرتے ہیں وہ لفظ آپکی شخصیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔لفظوں کا انتخاب کرتے وقت ہمیشہ احتیاط سے کام لینا چاہیے تا کہ لفظوں کی حرمت اور آپکا آئینہ داغدار نہ ہوں۔

جینڈر رسٹڈیز ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے شائع کردہ یہ میگزین اپنے اندر بہت سی جہتیں لیے ہوئے ہے۔اس سے آپ اس ڈیپارٹمنٹ کی صورت اور سیرت دونوں سے واقفیت حاصل کریں گے۔آج کی بدلتی ہوئی دنیا میں نئے نئے علوم نئی منزلوں کے نشان لئے ہوئے ہمارے سامنے کھڑے ہیں۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا منزل پہ پہنچنا ہی کامیابی ہے۔۔۔نہیں۔۔۔منزل پہ بہت سے لوگ پہنچ جاتے ہیں لیکن اصل کامیاب وہ ہوتے ہیں جو منزل پر پہنچ کر منزل کو اپنا ہم سفر بنا لیتے ہیں کیونکہ جب آپ منزل پر پہنچ کر رُک جاتے ہیں تو سفر رُک جاتا ہے، نئی منزلوں کی تلاش ختم ہو جاتی ہے۔اس تلاش کو ختم نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے جاری رہنا چاہیے کیونکہ اِسی میں زندگی پنہاں ہے۔تلاش کے ختم ہو جانے کا نام ہی موت ہے۔کسی مقصد کی تکمیل بظاہر ایک فل سٹاپ ہے لیکن یہ فل سٹاپ حرفِ آخر نہیں بلکہ اگلی دنیا کا ابتدائیہ ہونا چاہیے جس میں نئی منزل کی نشاندہی بھی ہوتی ہے اور رختِ سفر بھی۔جینڈر رسٹڈیز ڈیپارٹمنٹ کے طلبا و طالبات نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ اپنی تخلیقی و تحقیقی کاوشوں کو یکجا کریں۔وہ اس میں کتنے کامیاب ہوئے ہیں اس کا فیصلہ آپ نے کرنا ہے۔میں تو صرف یہی کہتی ہوں کہ یہ منزل نہیں راہِ منزل ہے۔میری دعا ہے کہ آنے والے لوگ نئی منزل کی تلاش میں نکلیں اور یہ سفر ہمیشہ جاری رہے۔

مدیرِ اعلیٰ
سعدیہ اکبر

تشنگانِ علم ودانش

علم ایک ایسا انوکھا نور ہے جس کی وجہ سے نور سے تخلیق شدہ مخلوق نے بھی انسان کو سجدہ کرلیا اور یوں انسان مسجود ملائک بنا۔لیکن ہمارا مسجود وہ ذات یکتا ہے کہ جس نے ہمیں بھی تخلیق کیا اور پھر پہلی وحی میں جو سبق بنی نوع انسان کو دیا وہ بھی علم ہی تھا۔ یعنی (اقرأ) نہ صرف پڑھنا بلکہ (علَّم بِالقلم) یعنی پڑھنا اور بذریعہ قلم سیکھنا۔یوں میں ایک طالب علم کی حیثیت سے یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ علم ہی انسانیت اور اسلام کی اساس ہے۔

علم سیکھنے کا ایک موثر اور منظّم ذریعہ مکتب ہے یعنی جہاں پڑھا لکھا جائے خواہ وہ سکول ہو یا یونیورسٹی یہی وہ ادارہ ہے جو مختلف طریقوں سے مختلف مضامین کی بنیاد پر انسان کو شعور اور آگہی دینے کی کوشش کرتا ہے۔اس مقصد کے لئے معلّم کے کیا فرائض ہیں اور کیا ادب وآداب ہیں اس کے لئے محمدؐ کی ذات گرامی ایک مثالی اُستاد بننے کیلئے ہمارے لئے نمونہ عمل ہے۔

لَقَد کَان لَکم فِی رسُولِ اللّٰہ اسوۃ'' حَسَنۃ''

یوں تو اللہ نے مجھے بڑے بڑے عہدوں سے نوازا اور ایسے نوازا کہ میں سوچتی ہی رہ گئی لیکن اس شعبہ کو جو ابھی پوری طرح پروان بھی نہیں چڑھا تھا یہاں اللہ نے غالباً مجھے اس دعا کے نتیجے میں بھیجا ہے جو میں عین مغرب کی نماز سے پہلے آسمان کی طرف دیکھ کر مانگا کرتی تھی کہ

''اے اللہ مجھے ایسی جگہ بھیج دے جہاں میں کوئی Positive اور Constructive کام کرسکوں''

قرآن مجید میں ہے

اُدعُونِی اَستَجِب لَکُم

''تم مجھے پکارو میں جواب دونگا''

میں اس قابل نہیں کہ یہ دعویٰ کرسکوں کہ اللہ نے میری دعا اُسی انداز میں سنی ہے جیسا میں کہتی تھی لیکن یہ حقیقت ہے کہ جو کام پچھلے ڈیڑھ سال میں ہوئے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے میں خود بار بار حیران ہو جاتی ہوں اور بے ساختہ اللہ کو سجدہ کرنے کو دل مچل جاتا ہے۔

Construction دو قسم کی ہوتی ہے۔میری کوشش ہے کہ بلڈنگ کے حصول اور ضروری سہولیات کی دستیابی کے

اسی سلسلے کی ایک **Intellectual Youth** کی طرف زیادہ توجہ دوں اور Character building بعداب کاوش ہے جو میں نے بذریعہ میڈم سعدیہ اور چند طلباء کے ذریعے شروع کرنے کی کوشش کی ہے اور اسطرح **ایک پنتھ دو کاج** والی کہاوت کو پورا کیا ہے یعنی میگزین تو ہے ہی لیکن میڈم سعدیہ کی بطور اس میگزین کی ایڈیٹر اور سٹوڈنٹس کی بطور رائٹرز یقیناً تربیت ہوئی ہوگی اور میں یہ وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

آخر میں سب سے پہلے وائس چانسلر ڈاکٹر مجاہد کامران کہ جن سے غیر رسمی سا یہ گلہ ضرور ہے کہ میری مرضی کے مطابق انہوں نے مجھے اتنا وقت نہیں دیا جتنا میں چاہتی تھی اور ان سے ہر مسئلہ پر سیر حاصل بحث کرنا چاہتی تھی لیکن ساتھ ہی اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اگر وہ قدم قدم پر ہمارے ساتھ تعاون نہ کرتے تو میں اتنا حوصلہ نہ کر پاتی۔ جب بھی کوئی لیٹر بھیجا گیا خواہ وہ کسی بھی نوعیت کا ہو نہ صرف وائس چانسلر نے اس کا فوراً جواب دیا بلکہ کارروائی بھی کی اور اس کا منہ بولتا ثبوت نہ صرف بلڈنگ بلکہ اسکے اندر لاتعداد ہونے والی چھوٹی بڑی نوعیت کی سہولیات اور Activities ہیں۔ ڈاکٹر مغیث الدین شیخ جو ڈین ہیں ہماری فیکلٹی کے تو ان کے بارے میں صرف یہ کہوں گی اگر ان کی چند جرأت مندانہ تجاویز اور ہمہ وقت ہماری مختلف Activities میں شمولیت نہ ہوتی تو میں اتنی محنت کے ساتھ شاید کام نہ کر پاتی۔

ڈاکٹر حفیظ جو کہ ڈائریکٹر ہیں انہوں نے ہمیشہ Community اور اداروں کی بات کی اور یہ یقیناً ان کی اعلیٰ ظرفی ہی ہے کہ انہوں نے باوجود اسکے کہ ڈائریکٹر ہیں کبھی مجھے کسی بات سے نہیں روکا اور یوں بتدریج کام ہوتے گئے۔

پریس کے ڈائریکٹر خالد خان جنہوں نے ہر موقع پر خواہ وہ ماضی کی بات ہو یا آج اس میگزین کی میرے لئے ایک مشیر اور راہبر کی طرح کام کیا ہے۔

اسکے بعد تمام ٹیچنگ فیکلٹی بشمول پارٹ ٹائم ٹیچرز، انتظامی فیکلٹی اور ہر وہ شخص جو کسی نہ کسی طرح اس کاوش میں شامل رہا ان کے لئے اور سٹوڈنٹس کیلئے دعا گو ہوں کہ وہ شعور کی بلندیوں تک پہنچنے کی کوشش کریں کیونکہ شعور جسکا دوسرا نام علم ہے اس کی ضد جہل ہے اور میں نہیں چاہتی کہ ہمارا ڈیپارٹمنٹ دورِ جاہلیت کی عکاسی کرے۔

نیک تمناؤں کے ساتھ

ثمر فاطمہ

انچارج چیئر پرسن

وہی جہاں ہے تِرا جس کو تُو کرے پیدا

تخلیقِ کائنات اظہارِ تخلیق ہے۔اظہار کی یہی صلاحیت قدرت نے انسان کے خمیر میں بھی پنہاں کر دی ہے۔ ہر انسان اس تخلیقی اظہار کیلیئے کوشاں ہے۔کوئی نئ ایجادات کر کے ،کوئی تحریروبیان سے اورکوئی پوشیدہ ءکائنات کی تحقیق کر کے اسکا اظہار کرتا ہے۔جینڈر رسٹڈیز ڈیپارٹمنٹ کے طلباء وطالبات کی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کارلانے کیلیئے **Intellectual Youth** اس ڈیپارٹمنٹ کا پہلا شمارہ ہے۔ یہ شمارہ اپنے ڈیپارٹمنٹ کی پہلی محبت ہے اوراس ادارے کی تاریخ میں پہلا قدم ہے۔جن طلباوطالبات نے اس شمارے میں اپناتخلیقی وتحقیقی حصہ ڈالا ہےانہوں نے اس ڈیپارٹمنٹ کی تاریخ کاایک اورسنگِ بنیادرکھا ہے۔مجھےخوشی ہے کہ میں جینڈر رسٹڈیز کے میگزین **Intellectual Youth** کی تخلیق میں حصہ دار ہوں اور یہ ایک اعزاز کی بات ہے۔میں اپنے ساتھی طلباوطالبات کے ساتھ ساتھ اساتذہ کا بھی مشکور ہوں کہ انہوں نے مجھے اس کام کیلیئے منتخب فرمایااور ہر قدم پر میری رہنمائی فرمائی۔میں امید کرتا ہوں کہ بعد میں آنے والے طلباوطالبات اسی محنت اورلگن سے اس میگزین کوخوب سے خوبصورت تر بناتے جائیں گےاورانکے سر پر بھی اساتذہ کی رہنمائی وشفقت کا سایہ رہے گا۔

محمد بابر حسین

مُدیر **Intellectual Youth**

نائب مُدیران کے پیغامات

باتیں تو بہت سی کہنی ہیں مگر سوچیں بکھری ہوئی ہیں۔ خالی کاغذ انتظار میں ہے کہ کب میں لکھا جاؤں گا مگر وہ لفظ ہاتھ نہیں پڑ رہے جن سے میرے اُن جذبات کو بیان مل سکے جو میں اپنے ڈیپارٹمنٹ اور اساتذہ کے لئے رکھتا ہوں۔ نجانے کیوں آج لفظ گونگے ہو گئے ہیں مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ جو محبت اور اپنائیت مجھے اپنے اساتذہ سے ملی ہے وہ میرے لئے ایک قیمتی سرمائے کی طرح ہے جیسے ایک مفلس کو اچانک کہیں سے ایک خزانہ مل جائے جسے وہ بہت سنبھال کر رکھے اور میں بھی یہ خزانہ بڑے مان سے ساری عمر سنبھالوں گا۔

Intellectual Youth میگزین بالکل ایک بچے کے پہلے قدم کی طرح ہے جو وہ پہلی بار اٹھاتا ہے۔ وہ قدم مکمل تو نہیں مگر بڑا خوبصورت اور یادگار ہوتا ہے۔ اس میگزین کی اصل خوبصورتی آپکی آراء ہوں گی جو ہمیں ادھورے قدم سے مکمل قدم کی طرف لے جائیں گی۔

حسن رضا

میرے لیے یہ کسی اعزاز سے کم نہیں کہ میں پنجاب یونیورسٹی اور خاص کر جینڈر سٹڈیز ڈیپارٹمنٹ سے تعلیم حاصل کر رہا ہوں۔ میرے لیے یہ بھی ایک بہت بڑا اعزاز ہے کہ میں اپنے ڈیپارٹمنٹ کے اس میگزین کا ادنیٰ سا خادم ہوں۔ اس میگزین کی وساطت سے میں اپنے دوستوں کو یہ پیغام دینا چاہوں گا کہ ڈگری اور علم میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ڈگری بے جان ہے اور علم زندگیاں دیتا ہے۔ کاش میں اور میرے جیسے میرے دوست ڈگری کے ساتھ ساتھ حصولِ علم کے طالب ہوں اور دنیا میں علم کی روشنی پھیلائیں۔

ہم اپنے اساتذہ کے بے حد شکر گزار ہیں جنہوں نے ہمیں علم کی دولت سے مالا مال کیا۔ یہ ہم پہ منحصر تھا کہ ہم بے کراں سمندر سے کیا حاصل کر سکے اور کیا نہیں۔ آنے والے دوستوں کے لیے علم کی خواہش کرنے کی دعا کرتا ہوں۔ اور امید کرتا ہوں کہ یہاں سے فارغ التحصیل معاشرے میں ترقی کا باعث بنیں گے۔

خرم خضر خان

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

مضامین

صنف (Gender) ایک تعارف

ارم رشید (2009-11)

صنف سے مراد وہ معاشی، سماجی اور ثقافتی خصوصیات اور مواقع ہیں جو کسی بھی معاشرے میں بحیثیت مرد یا عورت ان سے وابستہ کئے جاتے ہیں۔صنفی خصوصیات قدرتی یا حیاتیاتی نہیں ہوتی۔ یہ پیدائشی طور پر لڑکا یا لڑکی کو عطا نہیں کی جاتی بلکہ معاشرہ لڑکے یا لڑکی کے ساتھ مخصوص خصوصیات منسوب کر دیتا ہے۔اور پھر ان خصوصیات پر پورا اترنے کیلیئے دباؤ ڈالتا ہے۔جیسا کہ پدر شاہی نظام میں ہوتا ہے دنیا بھر کے بیشتر معاشروں میں پدر شاہی نظام عام ہے۔لیکن کچھ معاشروں میں عورتیں فیصلہ سازی میں مردوں پر حاوی ہیں۔صنعتی انقلاب سے پہلے بہت سے معاشرے مادر شاہی نظام کے تحت چل رہے تھے اور آج بھی افریقہ کے کئی قبائل میں مادر شاہی نظام موجود ہے۔اور کچھ مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں جہاں مرد اور عورت کی فیصلہ سازی میں برابر شمولیت ہوتی ہے ایسی مثالیں دنیا کے ہر معاشرے میں موجود ہیں لیکن یہ نظام تعلیم کے ساتھ مشروط ہے۔ اور صنف کا بنیادی مقصد بھی ایسے نظام کا قیام ہے جو متوازن ہو اور اس میں مرد اور عورت کو فیصلہ سازی میں برابر شمولیت حاصل ہو۔

بدقسمتی سے پاکستان کی زیادہ تر آبادی صنف کے بنیادی تصور سے ناواقف ہے اور جو لوگ تھوڑی بہت واقفیت بھی رکھتے ہیں تو ان میں یہ تصور عام ہے کہ Gender سے مراد صرف عورت کی بات کرنا اور اس کی تعمیر و ترقی کیلیئے کوشش کرنا ہے۔علاوہ ازیں عوام میں یہ بات بھی مشہور ہے کہ Gender عورت کی بے جا آزادی اور مغربی ایجنڈے کی پیروی کا دوسرا نام ہے۔جبکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔Gender یا صنف کا بنیادی مقصد ان تمام سماجی، ثقافتی، اقتصادی اور معاشرتی ذمہ داریوں کا جائزہ لینا ہے جو کوئی بھی معاشرہ لڑکا یا لڑکی پر عائد کرتا ہے۔مرد یا عورت کی حیاتیاتی خصوصیات کو جنس کہا جاتا ہے جو مرد اور عورت کے درمیان قدرتی ہیں۔Gender ان امتیازات پر بحث نہیں کرتا جو کہ قدرت نے حیاتیاتی طور پر مرد اور عورت کے درمیان قائم کئے ہیں بلکہ ان ذمہ داریوں کا جائزہ لیتا ہے جو ایک معاشرہ لڑکے یا لڑکی پر عائد کرتا ہے۔ان ذمہ داریوں میں عدم توازن کی بنا پر معاشرے میں بے چینی اور پریشانی کا خدشہ ہوتا ہے۔صنفوں کے تضاد کی صورت میں ترقی کا عمل رک جاتا ہے۔زندگی توازن کا نام ہے اور کسی بھی معاشرے کی ترقی اور نشوونما کیلیئے توازن

ہونا ضروری ہے۔عورت اور مرد جب حقوق وفرائض میں توازن کھو دیتے ہیں تو معاشرے میں بگاڑ پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔معاشرے میں اصناف کے معاشرتی، ثقافتی اور اقتصادی مسائل کے ایک سیر حاصل مطالعہ کیلئے اور اسے ایک جامع تحقیقی حوالے سے جاننے کیلئے اس ادارہ کا قیام عمل میں لایا گیا تا کہ دونوں صنفوں کے درمیان تمام معاملات میں توازن قائم کیا جاسکے۔ بدقسمتی سے جب صنفی تجزیہ کیلئے اعداد وشمار اکٹھے کئے گئے تو یہ بات سامنے آئی کہ عورت صنفی امتیاز کا شکار ہے۔یہی صنفی امتیازات معاشری کی تنزلی کا باعث ہوتے ہیں۔اس صنفی امتیاز کو ختم کرنے کیلئے وومن ان ڈویلپمنٹ(WID) کا نظریہ پیش کیا گیا جسکے تحت خواتین کی وسائل تک رسائی کیلئے مختلف ترقیاتی منصوبے تشکیل دیئے گئے اور ترقیاتی کاموں میں خواتین کے کردار کو فعال سمجھتے ہوئے انہیں ترقیاتی امداد دی جانے لگی۔اس طرح کے منصوبوں سے عورت کی حالت میں کوئی خاص فرق نہ آیا کیونکہ ان کی اقتصادی حالت تو بہتر ہوئی لیکن وسائل پر اختیار حاصل نہ ہوسکا اور دوسری طرف صنفی تعلیمات پر بھی عورت موافقت تعلیمات کی چھاپ لگ گئی جبکہ اصل میں ایسا نہیں ہے بلکہ اسکا مطمع نظر مرد اور عورت دونوں ہی کی بہتری ہے۔چنانچہ WID کے نظریہ سے صنف اور ترقی (GAD) کا نظریہ وجود میں آیا۔اس نظریے کے مطابق عورت اور مرد دونوں کو انکی ضروریات کے مطابق ترقی کے عمل کا حصہ بنانے پر زور دیا گیا۔دراصل ترقی کے عمل میں دونوں کی شمولیت ضروری ہے کیونکہ ایک صنف کو دوسری صنف کے تناظر میں ہی سمجھا جاسکتا ہے۔یہ تسلیم کرنا بھی ضروری ہے کہ ترقیاتی سرگرمیاں مردوں اور عورتوں پر مختلف انداز میں اثر انداز ہوتی ہیں۔صنفی حساسیت اور شعور کو ترقیاتی کاموں کا حصہ بنا کر اجاگر کرنا ہوگا۔صنف اور ترقی GAD کا نظریہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ مرد عورت کی ضروریات کا شعور رکھتا ہو اور اسے ترقی کے عمل میں براہ راست شریک کرے۔یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ خواتین کی زندگی صرف پراجیکٹس کی بدولت تبدیل نہیں ہوسکتی بلکہ اسکے لئے صنفی رشتوں کو منصفانہ بنانا ہوگا۔چنانچہ یہ سمجھ لینا بہت ضروری ہے کہ Gender کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ وہ معاشرے کی دو بنیادی اکائیوں ،مرد اور عورت کو باہم متصادم کرے بلکہ اسکا مقصد دونوں میں باہم مساوات پیدا کرنا اور حقوق وفرائض میں توازن لانا ہے اور اسی توازن کی بدولت ہی ایک صحت مند معاشرہ وجود میں آسکتا ہے۔بلاشبہ صحتمند معاشرہ ہی مضبوط ملک کا ضامن ہوسکتا ہے۔

اسلام اور خواتین ۔۔۔ایک سماجی مطالعہ

محمد عمر مبارک (11-2009)

پاکستانی سماج میں عورتوں کے کردار اور کارگزاری کے باب میں ہمیشہ افراط وتفریط پر مبنی نظریات واصول کارفرما رہے۔اسلامی نظام معاشرت نے ان میں اعتدال ومیانہ روی پیدا کرنے کی کوشش کی اور ان کو ممکنہ حد تک فطری بنایا۔اسلامی شریعتوں اور سماجوں نے عہد آدم سے لے کر رسول اللہؐ تک محکم اصول وقوانین کو زمان ومکان کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا اور دونوں جنسوں یعنی جنس قویّ وجنس نازک کے تمام فطری تقاضوں میں توازن پیدا کیا۔مگر آج اختلاط مردوزن کے باب میں ہماری سوچ بالعموم منفی رہتی ہے۔اس کے لیے ہماری ناقص تر معلومات ذمہ دار رہی ہیں جو صدیوں سے مردانہ توہمات کی پیدا کردہ ہیں۔(مظہر یٰسین، نبی اکرم ﷺ اور خواتین ۲۰۰۸)

اسلام نے عورتوں کو جو سماجی حقوق عطا کئے ہیں وہ بہت وسیع ہیں اور تقریباً ہر میدان حیات میں حاوی ہیں۔ہم کسی اور مذہب کی نہیں اپنے مذہب میں خواتین کی شخصی آزادی کو دیکھ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ خواتین اپنے تمام حقوق کے حصول اور اپنے اوپر کئے جانے والے مظالم کے تدارک کے لیے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آتی تھیں اور اپنے مسائل حل کرواتی تھیں۔اس آمد ورفتِ خواتین کے دو پہلو ہیں، ایک حقوق کی حفاظت اور ان کا حصول، دوسرا حقوق کے حصول کے لیے گھر سے باہر نکلنے کی آزادی۔ان تمام حقوق کے بہت سے واقعات ہیں۔تمام کو بیان کرنا مشکل ہے صرف چند کی طرف توجہ دلانی ہے۔

بہت سی خواتین نے اپنے والدین کے انجام کردہ نکاحوں کو ناپسند کیا اور خدمتِ نبویؐ میں آکر شکایت درج کروائی اور رسول اللہؐ نے ان تمام ناپسندیدہ نکاحوں کو مسترد کر دیا۔بعض خواتین نے اپنے شوہروں کے مظالم اور مار پیٹ کے واقعات آکر رسول اللہؐ سے صراحت کے ساتھ بیان کئے اور مظالم سے نجات پائی۔ایسے سماجی واقعات کی بھی کمی نہیں۔

ایک دن مدینہ کی کئی عورتیں رسول اللہؐ کی ازواجؓ سے اپنے شوہروں کی شکایت کی۔رسول اللہ ﷺ کو اس بات کا علم ہوا تو آپ ﷺ منبر پر کھڑے ہوئے اور لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

”آلِ محمدؐ کے ہاں بہت سی عورتیں اپنے شوہروں کے متعلق شکایات لے کر آئی ہیں۔یہ لوگ جن کی شکایت کی گئی

اچھے نہیں ہیں۔''(بخاری)

آپؐ نے مزید فرمایا۔

''تم میں بہترین وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے سب سے اچھا ہے اور میں تم سب سے بڑھ کر اپنے گھر والوں کے لیے اچھا ہوں۔''(صحیح بخاری)

ہمارے علماء کرام اپنی تقریروں میں حجۃ الوداع کے نکات بیان کرتے ہیں مگر کبھی کسی نے رسول اللہ ﷺ کے ان بیان کو کبھی نہیں بتایا جس میں رسول اللہؐ کے گرد ایک لاکھ حجاج تھے آپؐ نے ان سب سے مخاطب ہو کر بلند آواز میں فرمایا۔

''سنو! عورتوں کے متعلق بھلائی کی وصیت لو، سنو! عورتوں کے متعلق بھلائی کی وصیت لو۔''

آپؐ نے اس بات کو دو مرتبہ دہرایا اور امت محمدیہؐ کے مردوں کو عورتوں سے بھلائی کا حکم دیا ہے۔ اسی طرح رسول اللہؐ نے والد کو بیٹیوں کے ساتھ نرمی، رحم دلی اور محبت کی راہ اختیار کرنے کا حکم دیا اور فرمایا:۔

''جس آدمی نے دو لڑکیوں کی ان کے بالغ ہونے تک پرورش کی قیامت کے دن وہ اور میں یوں اکٹھے ہوں گے''

یہ فرما کر رسول اللہؐ نے اپنی انگلیاں جوڑ لیں۔

عہد نبویؐ میں اور بعد میں خواتین کو بہت سے سماجی حقوق اور معاشرتی تحفظات حاصل تھے۔ سیرت وحدیث اور تاریخی واقعات سے بھی یہ حقیقت ثابت ہوئی ہے کہ اسلامی حدود و قیود میں مرد و زن کے اختلاط کی پوری اجازت تھی نہ صرف اجازت تھی بلکہ ایک سماجی روایت بھی تھی۔ عرب کے دور جاہلیت میں اور بعد میں بھی ریاستِ اسلامی میں خواتین، مردوں کے ساتھ تجارت کرتی تھیں۔ حضرت خدیجہؓ کی تجارت کی مثال تو عام ہے اس کے علاوہ ان کی ایک بہن حضرت حالہؓ چمڑے کا کاروبار مکی عہد میں کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ رسول اللہؐ نے حضرت خدیجہؓ سے شادی کے سلسلہ میں ملاقات کسی بازار یا خدیجہؓ کے مقام تجارت پر کی تھی۔ (ابن کثیر جلد/ صفحہ 266)

اور بھی بہت سی خواتین اسلامی تاریخ میں ملتی ہیں جو تجارت کرتی تھیں۔ عہد فاروقیؓ میں حضرت حولاؓ عطر فروخت کرتی تھیں۔ حضرت قیلہ انماریہؓ بھی تجارت کرتی تھیں۔ حضرت زینب بنت جحشؓ ایک دستکار خاتون تھیں۔ آپ طرح طرح کی چیزیں تیار کرتی اور فروخت کر دیتیں، حضرت شفاءؓ کو رسول اللہؐ نے ایک بازار کی افسر مقرر کیا تھا۔

ایسے سماجی واقعات کی کمی نہیں جن میں خواتین کے کردار کی مثال نہ ملتی ہو تاریخ بھری پڑی ہے مسلمان خواتین کے

کارناموں سے خواہ وہ گھر میں ہوں، کاروباری زندگی میں مصروف ہوں یا زندگی کے کسی شعبہ میں ہوں وہ ہر عہد میں اپنے کارناموں اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکی ہیں۔ یہ ہمارا سماج ہے جو آج بھی عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھتا ہے اور گھر میں قید رکھتا ہے مگر اسلامی سماج نے مسلمان عورت کو وہ تمام حقوق دیئے ہیں جو ان کے لیے ضروری ہیں اور ان حقوق کو اگر بغور دیکھا جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسلام اور اسلامی سماج نے عورت کو با اختیار بنایا ہے۔

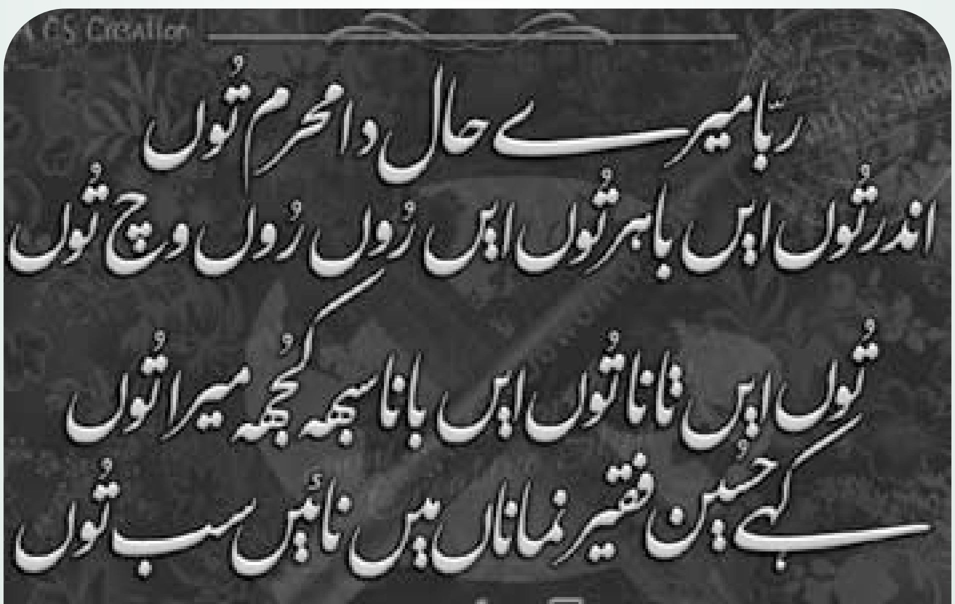

مسلمانوں پر دہشت گردی کا الزام کیوں؟

ارم رباب (2009-11)

زیرِ نظر تحریر ''مسلمانوں پر دہشت گردی کا الزام کیوں'' کو احاطہ تحریر میں لانے سے پہلے میں ضروری سمجھتی ہوں کہ ہمیں پتہ ہونا چاہیے کہ مسلمان کون ہے؟ دہشت گردی کیا ہے؟ اور الزام سے کیا مراد ہے؟

دینِ اسلام کو ماننے والا یا حلقہ اسلام میں داخل ہو جانے والا ہر فرد خواہ وہ کسی سرزمین کا بھی ہو بلا امتیاز رنگ و نسل مسلمان کہلاتا ہے۔ اسلام کے معنی امن و سلامتی کے ہیں۔ دہشت گردی ایک گھناؤنا عمل ہے جس کا بنیادی مقصد امن عامہ کو تباہ کرنا لوگوں کو خوف و ہراس میں مبتلا کرنا، معمول کی زندگی کو مفلوج کر دینا اور سلطنت کے امور میں رخنہ اندازیاں کرنا ہوتا ہے۔ الزام سے مراد ہے کہ کسی فرد گروہ یا قوم کو کسی ایسے عمل کا ذمہ دار ٹھہرانا جو ابھی اس پر یا ان پر ثابت نہ ہوا ہو۔

یقیناً آپ اس بات سے آگاہ ہوں گے کہ ملزم تمام عینی و قانونی شواہد کے بعد ہی مجرم قرار پاتا ہے۔ لہٰذا یہ بات طے ہے کہ مسلمانوں پر دہشت گردی کا صرف الزام ہے یہ کوئی مصدقہ حقیقت نہیں مندرجہ بالا حقائق کی وضاحت کے بعد اب ان حقائق اور وجوہات کا جائزہ لیں جو مسلمانوں پر اس لگنے والے الزام کا پیش خیمہ ہیں۔

مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کے مطابق

''اسلام امن و سلامتی کا دین ہے''

''جس نے ایک انسان کا قتل کیا وہ تمام انسانیت کے قتل کا مرتکب ہوا''

ہمارے پیارے رسول ﷺ نے اپنے لیے ''رحمت اللعالمین'' یعنی ''تمام جہانوں کے لیے رحمت'' کا لقب پسند فرمایا۔ تاریخ گواہ ہے کہ دین اسلام تبلیغ کے بل بوتے پر پھیلا نہ کہ تلوار کی یلغار سے تو پھر اس دین کے پیروکاروں پر یہ گھناؤنا الزام کیوں؟ اس کی تمام تر وجوہات میں سب سے زیادہ قابلِ غور وجہ میرے مطابق یہ ہے کہ درحقیقت آج کے اس پر آشوب دور میں ہماری زیادہ تر مشکلات کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم دینِ اسلام کی بنیادی تعلیمات کو بھول چکے ہیں۔

دین اسلام سے دوری کے سبب ہم میں اعلیٰ اسلامی اوصاف مثلاً صبر و تحمل، شکر و رواداری، اتحاد و یگانگت، فکر و عمل مساوات و برابری اور رحم دلی و تعاون کا فقدان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج جب ہمارا عمل کمزور ہے تو دنیا ہمیں تر نوالہ سمجھتی ہے۔

ہمارا استحصال بھی کرتی ہے اور ہمیں دہشت گرد بھی گردانتی ہے۔ ہم پر اس الزام کی دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم بحیثیت قوم متحد و منظّم نہیں ۔ ہم سب ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر کندھے سے کندھا ملا کر باہمی جدوجہد سے کوسوں دور ہیں ۔ ہمارے انفرادی کام کو کبھی بھی پہچان نہیں ملے گی جب تک ہم میں اجتماعی جذبوں کا فقدان ہوگا کیونکہ

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

تعلیم کی کمی بھی ان بنیادی وجوہات میں سے ہے جس کی وجہ سے ہم معتوب ٹھہرے اور یہ الزام کہ ''مسلمان دہشت گرد ہیں'' ہم پر دھر دیا گیا۔

تعلیم کی کمی وجہ سے ہم مندرجہ ذیل پریشانیوں میں مبتلا ہیں

۱۔ دین سے دور ہیں

۲۔ اپنا لائحہ عمل خود سے نہیں تیار کر سکتے

۳۔ دنیا جو کہ ایک گلوبل ولیج بن چکا ہے اس سے کٹ چکے ہیں

۴۔ اپنا زاویہ نگاہ موثر طریقے سے بیان کرنے سے قاصر ہیں

۵۔ ہم پر جاہل لوگوں کی چھاپ لگ چکی ہے اور جاہل لوگ ہی دہشت گردی جیسا گھناؤنا عمل کر سکتے ہیں

اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ ہم اپنا نقطہ نظر موئثر طریقے سے اقوامِ عالم تک پہنچانے میں ناکام ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ پڑھے لکھے لوگوں کو لائیں اور دنیا میں دینِ اسلام کا مثبت طریقوں سے پرچار کریں۔ تعلیم کی کمی سے مدرسے دینِ اسلام کے مطابق لوگوں کی تربیت نہیں کر رہے۔ اس لئے جب ہم دنیا میں بنیاد پرست افراد تیار کریں گے تو لوگ ہمیں دہشت گرد سمجھیں گے۔ تفرقہ بازی وہ زہر ہے جو ہمارے معاشرے کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ جب ہم میں تفرقہ بازی عروج پر ہوگی یقیناً دہشت گردی جیسے مسائل جنم لیں گے۔ ہمارے زیادہ تر مدارس کو ان کے مسلک کے مطابق باہر کے مما لک سے امداد جاری ہوتی ہے جو کہ فلاح کے کاموں کی بجائے غلط کاموں پر صرف ہوتی ہے اور یہ بھی دہشت گردی کا پیش خیمہ بنتی ہیں۔ انڈیا کی غلط بیانی اور سفارتی پروپیگنڈا بھی مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دینے میں ایک اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ انڈیا اپنی تمام تر تنگ نظری کے باوجود خود کو دنیا میں سیکولر ریاست کہتا ہے۔ اور اسکی ایک لابی ہر وقت پاکستان کے خلاف سفارتی محاذ کھولے رکھتی ہے۔ انڈیا کا یہ سفارتی پروپیگنڈا بھی مسلمانوں پر دہشت گردی کے الزام کی ایک بڑی وجہ ہے۔

اسلام دراصل دینِ فطرت ہے اور اپنی اعلیٰ تعلیمات کی بدولت جلد ہی تمام دنیا میں فروغ پا گیا ہے۔ دینِ اسلام کے آنے کے بعد تھوڑے ہی عرصہ میں آدھی دنیا پر دینِ اسلام کا پرچم لہرانے کی وجہ سے یہود و ہنود کی بڑی طاقتیں لرزہ براندام ہوئیں ان کا غرور خاک میں مل گیا لہٰذا ان کے دلوں میں اسلام کے خلاف بغض اور کینہ پیدا ہو گیا اور یہ تمام قومیں متحد ہو کر مسلمانوں کے خلاف ہر محاذ پر صف آراء ہو گئیں۔ ان سب قوموں کا یہ گٹھ جوڑ بھی مسلمانوں پر اِس الزام کی بنیادی وجہ ہے۔

مندرجہ بالا حقائق مسلمانوں پر اِس الزام کی بنیادی وجوہات ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے اوپر سے یہ الزامات دھونے کے لیے بحیثیت قوم متحد ہو جائیں اور دوسری قوموں کے پروپیگنڈا کا مقابلہ ذہانت اور سفارت سے کریں نیز اپنے عمل کو دینِ اسلام کے مطابق بنالیں۔ اپنے اندر رواداری پیدا کریں تاکہ ہم اس الزام سے چھٹکارا پالیں لیکن اس کے لیے ہمیں اپنے عمل و کردار میں اسلامی اوصاف کو اجاگر کرنا ہوگا۔ ہم میں خودی کا جذبہ پیدا ہو گیا تو ہم اقبال کے شاہین بن کر اندرونی و بیرونی قوتوں سے نبرد آزما ہو جائیں گے اور دہشت گردی کے ان تمام الزامات کو دھوڈالیں گے۔ انشاءاللہ

ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پُھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

آج کا انسان اور اس کا مستقبل

ارم رباب (2009-11)

سورج غروب ہونے کا منظر دیکھ کر دِل کی شکستگی بڑھنے لگتی ہے۔ دِل میں ایک عجیب سا احساس جنم لیتا ہے۔ سورج کے اطراف واکناف پر پھیلی ہوئی وحشت سے بھرپور سُرخی اِس احساس کو تقویت دیتی ہے کہ سورج بھی سسکتی ہوئی انسانیت پر اور انسانی قدروں کی پامالی پر خون کے آنسو رو رہا ہے اور رفتہ رفتہ یہ خون پر وحشی سُرخی تمام فلک کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی اور زمین پر انسان چاہے کسی خطہ زمین سے تعلق رکھتا ہو اور چاہے کسی بھی مذہب کا حامی وحامل ہو یہ بات اُس پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ انسان فانی ہے اُسے ایک دن مر جانا ہے اور مٹی میں مل کر مٹی ہو جانا ہے لیکن اسکے باوجود وہ اپنی ساٹھ یا ستر سالہ زندگی میں انسانی تباہی کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا اور یہی زہر وہ اپنی اگلی نسلوں میں منتقل کر رہا ہے۔

آج کا انسان اپنے چہرے پر دوغلے پن، جھوٹ وفریب، حرص و ہوس اور نفرتوں کے خول چڑھائے دوسرے انسانوں کو ختم کرنے کیلئے کوشاں ہے فطرت کی تباہی اور ماحولیاتی آلودگی سے انسان نے اپنی زندگی اور بھی تلخ کر لی ہے دولت کی ہوس اور آگے بڑھنے کی چاہ نے رشتوں کا تقدس پامال کر دیا ہے۔ رشتوں کی پہچان ختم ہوگئی ہے۔ طاقت کے حصول کی دوڑ نے آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا انسان انفرادی اور اجتماعی ہر دو محاذوں پر دولت وطاقت کی ہوس میں کمزور کا استحصال کر رہا ہے۔ انفرادی سطح پر جائیداد کے جھگڑے، غریبوں کی حق تلفی، اقربا پروری، رشوت، چور بازاری، سفارش اور جہیز جیسے مسائل ہیں اور یہی مسائل معاشرے کی ترقی کی راہ میں حائل ہیں، معاشرے کا ناسور بن چکے ہیں اور اعلیٰ اسلامی، ومعاشرتی نظام کو دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں جبکہ اجتماعی سطح پر امریکہ اور اسرائیل کی بدمعاشی تیسری دنیا کے ملکوں کا استحصال کر رہی ہے۔ امریکہ عراق اور افغانستان پر جنگ مسلط کرنے کے بعد ایران کو بھی جنگ کا ایندھن بنانا چاہتا ہے۔ اسرائیل امریکہ کی شہ پر آئے روز مظلوم فلسطینیوں پر مظالم ڈھاتا ہے اور بیت المقدس کی بےحُرمتی کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ ایٹم بم کی ایجاد نے حالات کی تلخی میں مزید اضافہ کر دیا ہے، ہیروشیما اور ناگاساکی کی دل دہلا دینے والی تباہی کے بعد دنیا ایک بار پھر ایک اور ایٹمی جنگ کی طرف بڑھ رہی ہے کتنا قابل ترس ہے آج کا یہ سہا سہا انسان جسے انفرادی واجتماعی ہر دو سطحوں پر خوف کا سامنا ہے لیکن افسوس! کہ یہ تمام تلخیاں اور خوف اُسکا اپنا ہی پیدا کردہ ہے۔ اسکی کوشش سے

حالات بہتر ہو سکتے ہیں۔ یہاں پر ایک بات قابلِ غور ہے کہ اگر انسان جانتا ہے کہ اُسکی زندگی ساٹھ یا ستّر سال پر محیط ہے تو وہ آئندہ نسلوں کے لئے آسانیاں پیدا کرنے کی بجائے مشکلات میں اضافہ کیوں کر رہا ہے؟ وہ اقتدار، طاقت اور دولت جیسی بے معنی چیزوں کیلئے انسانیت کے قتل کا مرتکب کیوں ہو رہا ہے؟ حالانکہ وہ جانتا ہے کہ اُسکے مرنے کے بعد طاقت، اقتدار اور دولت ہر چیز یہیں رہ جائے گی۔ یہی ایک بنیادی بات ہے جو ہماری سمجھ میں نہیں آتی اور ہم سب کچھ بھول کر اور تمام حقائق فراموش کر کے اپنے ہی جیسے انسانوں کو خوفزدہ کرنے اپنی طاقت کا سکہ جمانے اور فطرت کو تباہ کرنے میں مصروف ہیں۔ اگر آج کا انسان یہ بات سمجھ جائے تو ہم ان جان لیوا معاشرتی بیماریوں سے چھٹکارا پالیں گے۔ بے شک صحت مند معاشرہ ہی مضبوط ملک کا سبب ہوتا ہے اور جب ہم ملکی سطح پر مضبوط ہو جائیں گے تو بین الاقوامی معاملات پر دوسروں سے بلیک میل نہیں ہوں گے۔ اس طرح دنیا حقیقتاً امن و آشتی کا گہوارہ بن جائے گی۔ یقیناً ''مایوسی گناہ ہے'' ایسا ممکن ہے آپ بھی سوچیں اور اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں آپ کو چاہیے کہ اپنی تمام فطری صلاحیتوں کو مثبت انداز میں بروئے کار لاتے ہوئے قدرت سے مستعار لئے ہوئے زیست کے لمحات کو امر کر دیں اور اپنے لئے اور آئندہ نسلوں کیلئے دنیا کو خوشیوں کا گہوارہ بنا دیں۔

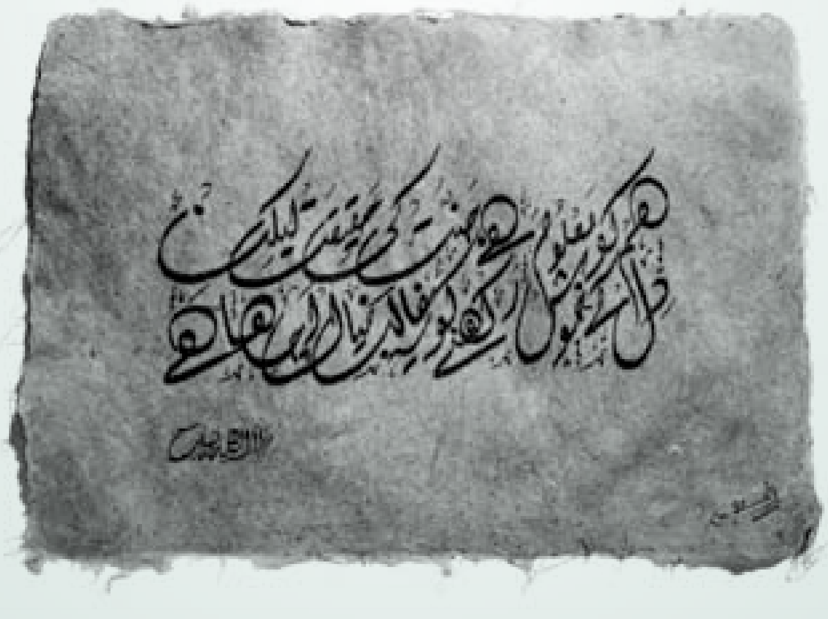

قائداورآج کا نوجوان

ماریہ غضنفر (2009-11)

نوجوان ملک کے معمار ہوتے ہیں۔کسی بھی ملک کی ترقی کا انحصار ملک کے نوجوانوں پر ہوتا ہے جنہوں نے مستقبل میں اس کو سنبھالنا ہوتا ہے۔جس ملک کا خواب علامہ اقبال نے دیکھا اور قائداعظم نے جسے تعبیر دی، انہیں اپنے نوجوانوں پر فخر تھا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارے نوجوان ہمارے قائدین کی توقعات پر پورا اتر رہے ہیں؟ کیا ہو گیا ہے ہمارے نوجوانوں کو جن کا وقت موبائل اور انٹرنیٹ پر یا پھر فلموں گانوں کو ڈسکس کرتے ہوئے ضائع ہو رہا ہے۔ملک کس بحران سے گزر رہا ہے اس سے ان کو کوئی سروکار نہیں ۔ پھر یہ کہتے پھرتے ہیں کہ ہمارے ملک کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ادھر ہمیں کام نہیں کرنا ہم نے باہر جا کر کمانا ہے اور یہ کہ پاکستان کی حالت کبھی بھی نہیں بدل سکتی۔اس رویّے کے متعلق علامہ اقبال نے فرمایا،

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی\
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

قائداعظم کی شخصیت کا اگر مطالعہ کیا جائے تو ہمیں پتا چلتا ہے کو انہوں نے ملک کی ترقی میں نوجوانوں کے کردار پر کتنا زور دیا ہے۔وہ چاہتے تھے کہ نوجوان ملک کے ہر طرح کے حالات، چاہے وہ سیاسی ہوں یا معاشی ان کے بارے میں ان کو مکمل باخبر ہونا چاہیے اور اس میں نوجوانوں کو اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔اس حوالے سے ایک واقعہ یہ ہے کہ قائداعظم کو ایک خط آگرہ سے موصول ہوا۔یہ لانبے کاغذوں پر لکھا ہوا چھ صفحے کا خط تھا اور سطریں بہت قریب قریب تھیں۔خط اردو میں تھا قائداعظم نے پہلے تو خط پڑھوا کر سنا اور جب ان کو بتایا گیا کہ راقم ایک تانگہ چلانے والا ہے تو وہ بہت خوش ہوئے اور اس کی سوجھ بوجھ کی تعریف کی۔جب چھ صفحے ختم ہو گے تو آخر میں یہ جملہ تھا ''قائداعظم !اب میرے پاس ایک سواری آ گئی ہے لہٰذا باقی کا خط کل لکھوں گا آپ انتظار کریں'' قائداعظم اس پر بہت ہنسے اور قائداعظم کے کہنے پر اس خط کا انگریزی ترجمہ کر کے انہیں دے دیا گیا۔دوسرے روز حسب وعدہ اس تانگے والے کا بقیہ مضمون موصول ہو گیا اور تعجب کی بات ہے کہ دونوں خطوں میں بڑا ربط تھا۔اس خط کی اہمیت اس طرح بھی معلوم ہو سکتی ہے کہ قائداعظم نے اس خط کو اپنی اسمبلی تقریر میں

استعمال کیا۔اس طرح وہ خط بہت مشہور ہوا اور مدتوں اس تانگے والے کے پتہ کی تلاش رہی تا کہ وہ اس کا شکریہ ادا کرسکیں لیکن وہ نہیں مل سکا کیونکہ اس نے سوائے آگرہ کے اپنے پتے کی کوئی وضاحت نہیں کی تھی۔اس واقعہ میں عوام الناس کے لیے یہ پیغام ہے کہ ہر شخص چاہے وہ اَن پڑھ ہو یا کوئی تانگہ چلانے والا، ملکی ترقی میں ایک اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔

قائداعظم عام طور پر بات چیت میں کافی تحمل سے کام لیتے تھے مگر جب کسی تعلیم یافتہ نوجوان کو ملکی سیاست اور حالات سے لاعلم دیکھتے تو انہوں کافی غصہ آتا۔ایک دفعہ ایک دعوت میں شریک ہوئے اور میزبان نے اپنے صاحبزادے کا ان سے تعارف کرایا کہ یہ حضرت حال ہی میں برما کے محاذ سے واپس آئے ہیں اور رخصت پر ہیں۔انہوں نے قائداعظم سے پوچھا کہ کیا ان کے خیال میں پاکستان اقتصادی طور پر کامیاب ہوسکتا ہے یا نہیں؟

قائداعظم نے سوال کیا کہ تمھارا کیا خیال ہے؟ تو فوجی افسر نے کہا ''جی ہاں'' قائداعظم نے پھر پوچھا کیوں؟ تو فوجی افسر سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور انہوں نے قائداعظم کو خوش کرنے کے لیے کہا کہ ''اس لیے کہ آپ کہتے ہیں'' اس پر قائداعظم بگڑ گئے اور کہا یہ تو کوئی جواب نہیں۔فوجی افسر نے کہا کہ ''میں ایک سپاہی ہوں اور میرا کام حکم کی بجا آوری ہے، مجھے حکومت سے کوئی سروکار نہیں'' قائداعظم نے جواب دیا کہ ''مجھے اپنی فوج میں ایسے آدمی نہیں چاہییں جن کو یہ معلوم ہی نہ ہو کے کس مقصد کے لیے لڑ رہے ہیں''

حالات کا شعور، قوم کے ساتھ وفاداری اور اعلیٰ شخصی اوصاف ہی وہ خوبیاں تھیں جو قائداعظم قوم کے نوجوانوں میں پیدا کرنا چاہتے تھے۔۱۳ اکتوبر ۱۹۴۷ کو طلباء کے وفد سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا؛

> ''پاکستان کو اپنے نوجوانوں اور بالخصوص طلباء پر فخر ہے جو آزمائش اور ضرورت کے وقت ہمیشہ صِف اوّل میں رہے ہیں، آپ مستقبل کے معمارِ قوم ہیں اس لیے جو مشکل کام آپ کے سر پر کھڑا ہے اس سے نمٹنے کے لیے اپنی شخصیت میں نظم وضبط پیدا کیجئے، مناسب تعلیم وتربیت حاصل کیجئے۔آپ کو پورا احساس ہونا چاہیے کہ آپ کی ذمہ داریاں کتنی زیادہ اور شدید ہیں۔ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہر وقت تیار اور مستعد رہنا چاہیے''

نصف صدی قبل قائد نے اپنے خطاب میں نوجوانوں کو جو سبق دیا وہ آج بھی مشعل راہ ہے۔ ہمارے آج کے نوجوانوں کو اپنے قومی ہیرو کی پیروی کرنی چاہیے اور ان کو آئیڈیل بنانا چاہیے کیونکہ ان پہ یہ ذمہ داری ہے کہ انہوں نے اقبال

کے شاہین کا خواب پورا کرنا ہے۔ پاکستان کو ترقی کی بلندیوں پر لے جانے کے لیے ضروری ہے کہ نوجوانوں کو ملکی معاملات کی سوجھ بوجھ ہو اور انہیں اِن معاملات کو حل کرنے کے لیے اپنا موثر کردار ادا کرنا چاہیے۔

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا ہمارا نوجوان قائد اور اقبال کی توقعات پر پورا اتر رہا ہے؟۔۔۔نہیں۔۔۔وہ تو گُم ہے ایک ایسی مصنوعی دنیا میں جس کی کوئی منزل نہیں۔عصر حاضر کی ایجادات کو ہمارے نوجوان نے محض وقت کو ضائع کرنے کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔

ذہنی دباؤ۔۔۔امراض کا پیش خیمہ

نایاب جاوید (2008-10)

عجیب بات ہے کہ آج کا انسان جہاں ارتقاء کی بلندیوں کو چھو رہا ہے وہاں وہ ڈپریشن اور مایوسی کا شکار بھی ہے۔
ایک ریسرچ کے مطابق ڈپریشن کے مریضوں میں 1990 سے تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔
ماہرین نفسیات کے مطابق بہت سے لوگ اپنی زندگی میں کم از کم ایک دفعہ شدید ذہنی دباؤ کے تجربے سے گزرتے ہیں جسے Major Depression کہتے ہیں۔اس کا دورانیہ زیادہ ہوتا ہے۔یہاں ایک بات کی میں وضاحت کرتی چلوں کہ روز مرہ میں بھی انسان بہت سی صورتوں میں ذہنی دباؤ کا شکار ہو جاتا ہے لیکن آہستہ آہستہ وہ اس کیفیت سے باہر نکل جاتا ہے۔لیکن بعض اوقات محرکات اتنے شدید ہوتے ہیں کہ انسان اس پر قابو نہیں کر پاتا تو ایسی حالت میں وہ Major Depression کا مریض بن جاتا ہے۔وہ انتہائی افسردگی کا شکار ہو جاتا ہے۔زندگی کی تمام دلچسپیوں اور رنگینیوں کا خاتمہ، موت یا خودکشی کے بارے میں بار بار سوچنا، قوت فیصلہ اور ہمت کا خاتمہ ہو جانا، روزِ مرہ کی سرگرمیوں اور کارکردگی کا معیار خراب ہونا، توجہ مرتکز کرنے میں مشکل ہونا اور نیند کا خلل وغیرہ ذہنی دباؤ کی علامات ہیں۔
یہ مرض دوسری بہت سی امراض کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔''ویلیمین اور کسیلر'' نے دو الگ الگ مطالعات میں اس کی شرح معلوم کی ہے جو کہ 5% سے 17% تک ہے۔عورتوں میں یہ شرح دوگنی سے زیادہ ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ زیادہ وقت گھر پر گزارتی ہیں۔اور انہیں ایسے مواقع میسر نہیں ہوتے جیسے سیر کرنا یا اپنی دلچسپی کے کچھ امور سرانجام دینا۔اس وجہ سے وہ جلد ذہنی دباؤ کا شکار ہو جاتی ہیں۔گرد و پیش کا ماحول، گھر کے حالات، ملازمت کا ماحول، میاں بیوی میں ناچاقی اور سسرال کے مسائل انہیں زیادہ متاثر کرتے ہیں۔
اب یہ دیکھتے ہیں کہ ڈپریشن کا مرض کیوں ہوتا ہے یعنی اس کی وجوہات کیا ہیں۔
ا۔ڈپریشن کا مرض موروثی بھی ہوتا ہے یعنی اگر والدین میں سے کوئی شدید ڈپریشن کا مریض رہا ہو تو پھر ایسے فرد کے ڈپریشن کے مرض میں مبتلا ہونے کے امکانات دیگر افراد کے مقابلے میں 8 گنا زیادہ ہیں۔
۲۔ذاتی وقار میں کمی سے بھی فرد خود کو بے وقعت سمجھتا ہے۔اس میں مایوسی کا میلان پیدا ہونے لگتا ہے۔زندگی کا

روشن پہلو دیکھنے کی بجائے تاریک پہلو دیکھنے سے بھی افسردگی کا امکان بڑھتا ہے۔

۳۔فرد کی طبعی قوتِ برداشت بھی اس ضمن میں بہت اہم ہے۔فرد اگر ذرا ذرا سی بات پر چڑ چڑے پن کا مظاہرہ کرے تو اس مرض کا امکان بڑھ جاتا ہے۔

۴۔زندگی کے ابتدائی دور کے تلخ تجربات بھی فرد کو تاعمر متاثر کرتے ہیں۔کبھی رنجیدہ فرد کے ساتھ رہنے سے بھی رنجیدگی کا میلان پیدا ہو جاتا ہے۔

۵۔جسمانی امراض طویل اور پیچیدہ ہو جائیں یا طویل دورانیے تک فرد کو ادویات کے زیر اثر رہنا پڑے تو بھی وہ افسردگی کا شکار ہو سکتا ہے۔

WHO کے مطابق 2020ء تک ذہنی دباؤ، دل کے مرض کے بعد دوسرا بڑا امرض بن جائے گا۔تو ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم مثبت طرزِ زندگی اپنا لیں یا دوسرے لفظوں میں اپنی سوچ کو مثبت زاویوں پر چلانا شروع کر دیں۔چھوٹی چھوٹی باتوں کا برا منانا چھوڑ دیں۔پانچ وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے جھک کر اپنے قلب و زبان کو اس کی یاد سے تر رکھا جائے۔اور اگر ڈیپریشن کا مرض لاحق ہو جائے تو ایسے مریضوں کا علاج کروایا جائے۔مصروفیت بھی ڈیپریشن میں کمی پیدا کرتی ہے۔اپنی مدد آپ کے طریقوں میں سے کوئی طریقہ اختیار کر لیا جائے تو بہتر ہوگا۔مثلاً اگر آپ کسی غم یا خلفشار کا شکار ہیں تو اپنے مونس و غمخوار کو اپنی کیفیت سے آگاہ کریں۔رونا آ رہا ہو تو رو لیں اس سے جی ہلکا ہو جاتا ہے۔پرسکون رہنے کی کوشش کریں۔صحت بخش غذائیں، تازہ پھل اور سبزیاں ضرور لیں، نیند پوری کریں، پراُمید رہیں، زندگی کے روشن پہلوؤں پر سوچیں اور اپنے آپ کو یقین دلائیں کہ آپ کوشش کر کے اپنی کیفیت میں تبدیلی لا سکتے ہیں۔ہمارے انداز فکر اور طرز زندگی میں مثبت تبدیلیاں، قناعت پسندی، باہمی رواداری اور محبت ذہنی صحت کی بحالی میں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔

ادویات سے علاج اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے لیکن ماحول اور لوگوں کی سوچ میں تبدیلی پیدا کرنا بھی ضروری ہے تا کہ وہ سر چشمہ ختم کیا جا سکے جہاں سے ذہنی امراض جنم لیتے ہیں۔لہٰذا خوش رہیے اور ہمیشہ چیزوں کے روشن پہلوؤں کو دیکھیں۔اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمیشہ پرامید رہیے۔

کیوں اوئے تیرا تعلق کہیں القاعدہ سے تو نہیں؟

جناب! اس کے بستے میں تو قاعدے ہی قاعدے ہیں

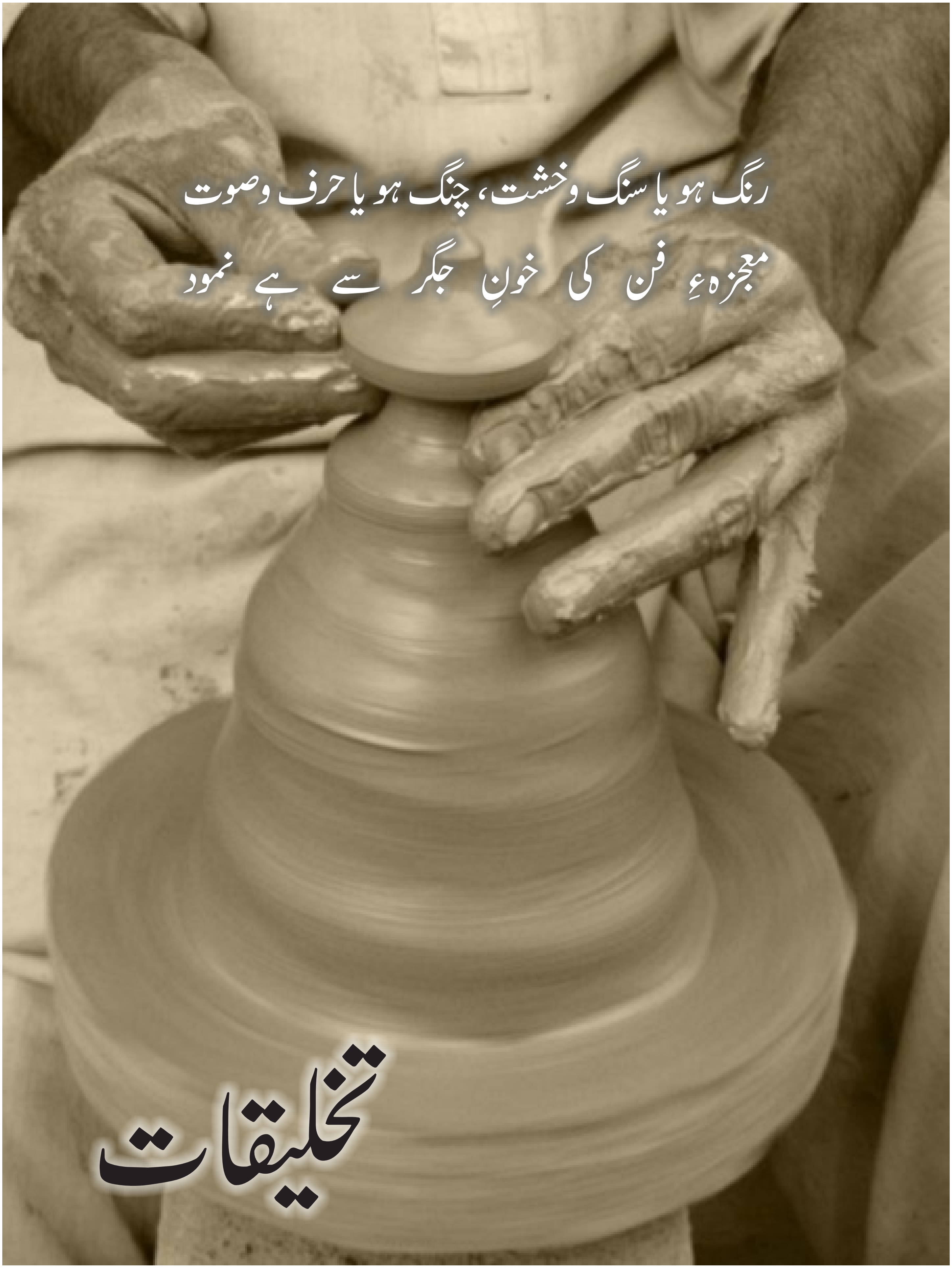
رنگ ہو یا سنگ و خشت، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزہءِ فن کی خونِ جگر سے ہے نمود
تخلیقات

قصّہ کہانی

کہانی کار

حسن رضا (11-2009)

میں ایک کہانی کار ہوں۔ میرے مہمان اکثر کئی کردار ہوتے ہیں۔ جن کو کاغذ پر منتقل کر کے زندگی کے حوالے کرتا رہتا ہوں۔ مگر آج کل میرے مہمان مجھ سے روٹھے ہوتے ہیں لیکن میرے لئے تو سارے مہمان ایک سے ہیں۔ میں کیونکر ان میں فرق کروں۔ مگر کل جو میں سلیم الٰہی کو لکھنے بیٹھا جو ایک قصبہ کے چھوٹے سے اسٹیشن پر اسٹیشن ماسٹر ہے۔ جس کے بالوں میں سفیدی اس لیے نہیں آئی کہ وہ بوڑھا ہو گیا ہے بلکہ اس کے بالوں میں یہ سفید دکھ اس لیے آیا ہے کہ اس کی بیٹیاں اپنے بیاہ کے انتظار میں امید کی آخری سیڑھی پر بیٹھیں ہیں۔ مگر اسی لمحے احمد مجھے تنگ کرنے لگتا ہے کہتا ہے پہلے مجھے لکھو گے دیکھو کہ میری ماں اور بہنیں آج بھی میرا انتظار کرتی ہیں اگر تم لکھو گے تو انہیں پتا چل جائے گا کہ اس دن جب میں گھر سے دفتر کے لیے نکلا تھا کہ ایک خودکش دھماکے کی نذر ہو گیا جس کے کرنے والے شخص کو مذہب کے نام پر اتنا اندھا کر دیا گیا تھا کہ جس نے یہ بھی نہ سوچا کہ مجھ احمد جیسے کئی بے گناہ مارے جائیں گے کہ جن کے گھروں کے در آج بھی ان کے انتظار میں کھلے ہیں۔ پھر مجھے کائنات آ کے ٹوکنے لگتی ہے کہتی ہے کہ میرا حق تم پر سب سے پہلے ہے کیونکہ تم نے میرے ہر آنسو کو اپنے دل پر گرتا محسوس کیا ہے۔ جو میں نے خاور کی بیوفائی پر بہائے ہیں مگر ان سب سے ہٹ کے میں کیا کروں کہ بابا رحما کی صدا مجھے سونے نہیں دیتی جو سارا دن اپنے سائیکل پر غبارے بیچتے ہوئے لگاتا ہے۔ مگر اس کے سننے والے کو کافی دیر بعد پتا چلتا ہے کہ وہ کیا بیچ رہا ہے۔ کیونکہ اس عمر میں منہ میں دانت نہیں رہتے پر اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑتا چاہے عمر جتنی بھی ہو۔۔۔۔

میں ان سب لوگوں میں الجھ سا گیا ہوں۔ رات گئے تک یہی کشمکش جاری رہتی ہے اور پھر جب کوئی چارہ نہیں رہتا تو ٹیبل لیمپ آف کر کے خود کو اندھیرے میں چھپا لیتا ہوں۔

رشتوں کی الجھن

نصرت خان (2009-11)

شادی ہر انسان کی خواہش ہے اور اگر شادی من چاہے ہم سفر سے ہو تو زندگی کی راہ گزار زیادہ سہل محسوس ہوتی ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ کہانیاں حالات و واقعات کی پیداوار ہوتی ہیں۔ ایسی ہی ایک کہانی حناء اور تیمور کی ہے۔ حنا اور تیمور آپس میں ماموں زاد تھے۔ حنا تیمور کے ماموں کی بیٹی اور تیمور حنا کی سب سے بڑی پھوپھو کی انتہائی لاڈلی اولاد تھی۔ حنا اسلم خان سب سے سمجھدار تھی۔ اسلام خان کی چار بیٹیاں اور ایک بیٹا علی تھے۔ اسلم خان اور اس کی بیوی رقیہ بیگم نے بچوں کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی کچھ ایسا ہی حال نصیر خان کے بہنوئی (اسلم خان) اور ان کی بہن صائمہ کے خاندان میں بھی تھا۔ انہوں نے چاروں اولادوں کی تربیت اعلیٰ طریقے سے کی تھی لیکن اس کے باوجود تیمور کافی خودسر ثابت ہوا۔ نصیر خان نے اپنے چھوٹے بھائی سلیمان کے لیے اسلم خان کی بڑی بیٹی نیلم کا رشتہ مانگ لیا۔ خاندان میں کسی کو بھی اس پر اعتراض نہیں تھا۔ سو شادی خیر و عافیت سے طے پائی اور نیلم اپنی پھوپھی صائمہ ہی کی دیورانی بن کر اس گھر میں آ گئی۔ جہاں یہ شادی نیلم اور سلیمان کے سنگم کا باعث بنی نیلم کی دادی نے مذاق مذاق میں خاندان کی عورتوں سے کہا کہ اپنے اکلوتے بیٹے علی کے لیے زمرد کو مانگیں گے۔ یہ بات پہنچتے پہنچتے نصیر خان تک بھی پہنچ گئی اور انہیں اپنی بیٹی کا مستقبل محفوظ نظر آنے لگا۔ زمرد نصیر خان کی سب سے سلجھی ہوئی اولاد تھی۔ زمرد کو جب اس کی سہیلیاں علی کے نام سے چھیڑنے لگیں تو گاؤں کی اس سیدھی سادھی لڑکی نے ہزاروں سپنے سجا لئے۔ یہ بات تو بچپن کی تھی پھر حالات بدلے اور علی شہر آ کر کالج میں پڑھنے لگا۔ علی ایک خوبرو نوجوان تھا اور بہت جلد ہی شہر کی آب و ہوا اس پر اثر کر گئی اور اپنی ایک ہم جماعت کے عشق میں غرق ہو کر اس نے گھر والوں سے سحرش سے شادی کی فرمائش کر دی۔ اسلم خان کسی ڈر سے اس شادی کے لیے نہ مانے لیکن بیٹے کی جان دینے کی دھمکی اثر کر گئی۔ اور وہ علی کا رشتہ مانگنے بالآخر چلے گئے۔ خاندان میں بھونچال آ گیا نصیر خان کی روایتی پٹھانوں والی غیرت جاگی۔ اور یہ غم کہ ان کی بیٹی کا رشتہ اسلم خان نے چھوڑا ہے انہیں تڑپائے رکھتا۔ اسی غصے میں انہوں نے اپنی بیگم اور بھابی دونوں کا میکے جانا بند کر دیا۔ حتیٰ کہ وہ علی کی شادی میں بھی شریک نہیں ہوئیں۔ ہر کوئی اپنی جگہ پر دکھی تھا۔ لیکن سب سے بری حالت تو زمرد کی تھی۔ وقت نے اسے بے بس کر دیا تھا اور پھر پٹھان خاندان کی روایات اسے اجاڑ گئیں۔ تمام عمر میرے گھر کا ایک در

کھلا رہا میں راہ تکتی رہی وہ راستہ بدلتا رہا۔ واقعات اور حالات سب کچھ سکھاتے ہیں اور یہی زمرد کے ساتھ ہوا۔ علی کے شادی کے چھ ماہ بعد ہی زمرد کی شادی بھی خاندان میں سے آنے والے ایک رشتے سے طے پا گئی۔ شاید اللہ کو زمرد کا صبر پسند آ گیا اور اس کو شوہر اور سسرال دونوں ہی توقعات سے بڑھ کر اچھے ملے۔ اور بلال کی سنگت سے زمرد کی زندگی کو ایک نئی راہ ملی۔
حنا اور تیمور کے پیار کا وہ رشتہ جو نیلم اور سلیمان کی شادی کے دوران دونوں کے دلوں میں ابھرا اور خاندان میں ہونے والے اتار چڑھاؤ اس پر کوئی اثر نہیں کر سکے۔ وہ بگڑا ہوا تیمور جس سے خاندان کا ہر بندہ پناہ مانگتا تھا۔ حنا کے پیار نے اس کو سنوار دیا ۔ اب جب علی اور زمرد دونوں اپنے اپنے گھروں میں اپنے بچوں کے ساتھ خوش تھے۔ تو خاندان کے بڑوں نے فیصلہ کیا کہ اسلم خان اور نصیر خان میں صلح کروانے کا بہترین ذریعہ حنا اور تیمور کی شادی ہے۔ سو نصیر خان بزرگوں کے کہنے پر حنا کا رشتہ تیمور کے لیے مانگنے گئے پر یہ سب اسلم خان کو مطمئن نہ کر سکا۔ لیکن وہ حنا اور تیمور کی پسندیدگی کو جانتے ہوئے ہاں کر بیٹھے۔ او ریوں حنا اور تیمور کو ایک دوسرے کے ساتھ کی صورت میں منزل ملی۔ کافی دھوم دھڑکے سے نکاح ہوا، مٹھائیاں بانٹی گئیں۔ ہر کوئی اپنی جگہ خوش تھا۔۔۔نہیں تھا۔۔تو وہ اسلم خان کا دل تھا جو گھبرا رہا تھا۔ اور ان کے تمام خدشات اگلی صبح سچ ثابت ہوئے جب انہوں نے تیمور کی طرف سے حنا کے لیے طلاق نامہ اور یہ خط وصول کیا کہ بہن اور بیٹی کا رشتہ چھوڑنے کا غم کیا ہوتا ہے اسے محسوس کرو ہم نے تیمور کا نکاح صرف زمرد کا بدلہ لینے کے لیے کیا تھا۔ یہ سب کے لیے دل دہلا دینے والی خبر تھی۔ لیکن سب ہی کچھ دن رونے پیٹنے کے بعد پر سکون ہو گئے۔ لیکن تباہ کون ہوا؟ ایک تیمور اور دوسری حنا۔ تیمور جس کی زندگی حنا تھی۔ باپ کے ہاتھوں مجبور ہو کر طلاق دی اور پھر ہمیشہ کے لیے باپ سے منہ موڑ لیا اور کراچی جا بسا۔ صرف ایک سال کے اندر اندر وہ جوا، نشہ اور نہ جانے کس کس برائی میں پڑ گیا اور آخر کار ایک طوائف روبینہ کو بیاہ کر گھر لے آیا۔ باپ مرتا کیا نہ کرتا۔ روبینہ کو بہو مانا اور گھر میں جگہ دی۔ اور ادھر حنا نہ زندوں میں تھی نہ مُردوں میں سے۔ حنا مکمل طور پر اس شعر کا عکس بن چکی تھی

ہمیں ان ہی کا تھا ان ہی کا ہوں،
وہ میرے نہیں تو نہ سہی
میسر طور ہو میسر حشر ہو ہمیں قبول ہیں
وہ کبھی ملیں، وہ کہیں ملیں، وہ کبھی سہی، وہ ملیں سہی۔

ماں باپ نے حنا کا دھیان ہٹانے کے لیے اُس کی شادی کی اور شادی کے 3 ماہ بعد ہی حنا بیوہ ہو کر ماں باپ کے در پر واپس آ گئی۔ ابھی شاید اس کے امتحانات باقی تھے۔ روبینہ نے ایک سال کے اندر اندر تیمور اور اس کے خاندان کو سڑک پر لا کھڑا کیا۔ اور پھر بیٹی کی پیدائش کے بعد اسے لیکر واپس اپنے میکے چلی گئی۔ تیمور نے روبینہ کو طلاق دی اور بیٹی اس نے اس شرط پر واپس کی کہ ساری دولت روبینہ کے نام کر دی جائے اور یوں نصیر خان پوتی کے بدلے میں جائیداد سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ تیمور نشے میں غرق رہتا اور اسی حالت میں ایک دن سڑک کے کنارے وہ اسلم خان کو ملا۔ ان سے بھانجے کی یہ حالت دیکھی نہ گئی۔ اسے ہسپتال میں داخل کروایا بہن اور بہنوئی کو پھر سے گلے لگایا۔ اور تیمور تندرست ہونے کے بعد ماموں کے توسط سے جاب کرنے لگے اور پھر وہ دن آیا جب تیمور اور حنا کے ملنے کی اصل گھڑی آئی لیکن جب نصیر خان نے اپنی جھولی پھیلائی تو اسلم خان سے پہلے حنا نے انکار کر دیا۔ جب یہ بات تیمور کو پتہ چلی تو وہ خود حنا کے روبرو گیا۔ اور اس سے صرف یہ کہہ سکا کہ اگر تم روئی ہو تو تڑپا میں بھی ہوں لیکن اب مجھ سے میری خوشی مت چھینو اور وہ بے وقوف لڑکی جو ہزاروں شکوے اور گلے دل میں رکھتی تھی۔ یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ کیوں میری عزت نفس کو مجروح کیا؟ اور تیمور کی دلہن بن کر اس کے سنگ دوبئ چلی گئی۔

یہ دونوں آج بھی خوش ہیں۔ حنا نے تیمور کی بیٹی کو ماں کی کمی کبھی محسوس نہیں ہونے دی۔ یہ سارا وقت گزر گیا لیکن وہ کرب ان کے چہروں پر آج بھی جھلکتا ہے جو معاشرے کی فرسودہ رسومات نے اُنہیں دیا۔

ناکام

حسن رضا (2009-11)

اس سے پہلی ملاقات ایک کالج کے استقبالیہ پر ہوئی تھی ان دنوں امتحانات سے فارغ ہوا تھا کرنے کو کچھ بھی نہ تھا۔اس لیے سوچا کہ فرنچ زبان سیکھ لی جائے اسی سلسلہ میں اس کالج گیا تھا۔اور وہ وہاں استقبالیہ پر تھی۔ پوچھنے پر اس نے کورس کے متعلق پیشہ ورانہ انداز میں بتانا شروع کیا اور چند لمحوں میں کورس کے متعلق سب کچھ بتایا۔

دوسری بار اس سے تب ملا جب کالج میں باقاعدہ ایڈمیشن لینے گیا وہ صبح بڑی روشن تھی سردی ختم ہونے کو تھی۔اور موسم بہار کے پھولوں نے سارے شہر کو مہکا رکھا تھا۔اس دن وہ سفید لباس میں ملبوس تھی۔اور چہرے پر پہلے سے زیادہ معصومیت تھی بعض اوقات بے معنی سے لمحے کتنے با معنی ہو جاتے ہیں۔اس بات کا احساس مجھے اس وقت اس سے باتیں کرتے ہوئے ہوا۔میں پہلی نظر کی محبت پر یقین نہیں رکھتا تھا۔لیکن نہ جانے کیوں اُس دن اسکے سامنے سب کچھ ہار جانے کو تیار ہو گیا۔

کلاس لیتے ہوئے ایک ہفتہ ہی گزرا تھا اس دن ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی اور وہ کالج سے فارغ ہونے کے بعد بس اسٹاپ پر کالج وین کا انتظار کر رہی تھی۔کہ میں نے اس کو اپنی موٹر سائیکل پر گھر تک چھوڑنے کی دعوت دی جسکو اس نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد قبول کر لیا اور پھر یہ ہمارا روز کا معمول ٹھہرا؛

ذکیہ ان لڑکیوں کی طرح تھی جو تھوڑا شوق اور کچھ مجبوری کی وجہ سے ملازمت کی طرف آ جاتیں ہیں اور خود کو حالات کے مطابق ڈھالنے میں زیادہ وقت نہیں لگاتیں۔

میں جب اسے کہتا ذکیہ تم میری روح تک سرایت کر گئی ہو اور مجھے پتا ہی نہیں چلا تو وہ کہتی کہ سچ مچ تم مجھ سے اتنی محبت کرتے ہو؟ میں چپ سا ہو جاتا۔کالج سے فارغ ہونے کے بعد ہمارا وقت کسی پارک یا ریسٹورنٹ میں گزرتا۔اور چھٹی والے روز ہم کسی سینما میں فلم دیکھتے اور ڈھیروں باتیں کرتے ذکیہ کے ساتھ گزرنے والا وقت اتنی تیزی سے گزر جاتا کہ بہت ساری باتیں ان کہی رہ جاتیں اکثر ایسا ہوتا وہ باتیں کرتی رہتی اور میں خاموشی سے اس کو دیکھتا رہتا اور کبھی کبھار جب وہ باتیں کرتے کرتے میری طرف دیکھتی تو کہتی ''جواد'' اور میں چونک سا جاتا۔

وقت گزرتا جا رہا تھا اور اک انجانا سا خوف مجھے تنگ کرتا رہتا تھا کہ آنے والے وقت میں کیا چھپا ہو۔بہت کم وقت

میں ہم اک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ میں جو اپنی تلاش میں نکلا ہوا اک مسافر تھا میری منزل ذکیہ تھی کیونکہ مجھے اس میں اپنا آپ نظر آتا تھا۔ مگر پھر بھی ذکیہ نے کچھ فاصلہ سا رکھا ہوا تھا۔ وہ ایسی بارش تھی جو کبھی کھل کر نہ برسی تھی۔ میں اکثر اس کی بے رخی سے ڈر سا جاتا تھا۔

کالج جاتے ہوئے چھ ماہ بیت گئے تھے ذکیہ نے کچھ دنوں سے یہ تقاضا شروع کر دیا تھا کہ جواد تم کہیں ملازمت کیوں نہیں کرتے اور میں اسے کہتا کہ میں کئی جگہوں پر عرضیاں دے چکا ہوں۔ اس پر وہ کہتی کہ میری ماں کو تو میری شادی کی بہت جلدی ہے اور میں خاموش ہو جاتا۔ رفتہ رفتہ وہ مجھ سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ شاید اب وہ میری بات کو رد کرنے لگی تھی۔ جب میں کہتا کہ ذکیہ یہ کیا ہے؟ اور تم ایسا کیوں کر رہی ہو؟ تو وہ کہتی ایسی کوئی بات نہیں جواد تمہیں یونہی لگتا ہے یوں کہتے ہوئے وہ میری بات ٹال دیتی تھی۔ اس دن چھٹی تھی اور موسم بہت اچھا تھا۔ ہم لوگ سینما فلم دیکھنے گئے۔ ذکیہ فلم دیکھتے ہوئے چپس بڑے شوق سے کھاتی تھی اور فلم میں اگر کوئی سین پسند یا ناپسند ہوتا تو فلم کے درمیان میں ہی اس پر بتصرہ کر دیتی لیکن اس دن اسکے چہرے پر عجیب کشمکش تھی جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ مگر کہہ نہیں پا رہی تھی۔ آدھی فلم گزری تو وہ بولی جواد کل میرا خالہ زاد آیا تھا گھر۔ اس کی نئی نئی ملازمت ہوئی ہے اسٹیشن ماسٹر کی اسکے بعد وہ نہیں بولی اس دن کے بعد ذکیہ وہ پہلے والی ذکیہ نہ رہی اس نے پہلے تو چھٹی والے دن میرے ساتھ فلم دیکھنا چھوڑی اور پھر روز کا ملنا بھی ہفتے میں آ رہا۔ امتحان سے اک دن پہلے احسن نے مجھے فون کیا جو میرے ساتھ کلاس میں پڑھتا تھا حال پوچھنے کے بعد وہ بولا جواد، تمہیں پتا چلا ۔۔۔۔۔ وہ ذکیہ نہیں تھی، ہمارے کالج کی ریسپشنسٹ؟ اس کی اگلے ہفتے شادی ہو رہی ہے۔ اور مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ میں آج کالج گیا تھا شمائلہ بھی آئی ہوئی تھی اس نے بتایا تھا سناؤ تمہاری تیاری کیسی ہے کل آ رہے ہو نہ پیپر دینے؟ میری آواز گلے میں ہی پھنس کے رہ گئی میں صرف اسے یہی کہہ سکا کہ میری طبعیت اچھی نہیں شاید میں نہ آ سکوں اسے کیا بتاتا کہ میں تو امتحان سے پہلے ہی فیل ہو گیا تھا۔

سخن وری

ایک خانہ بدوش لڑکی کا المیہ

میرے بزرگوں نے جانے کتنی
دعائیں کی تھیں
کہ ان کے گھر میں
عدم سے کوئی وجود آئے
بس ایک بیٹا ہو پھول سا جو
خوشی کی لے کے نوید آئے
مگر۔۔۔۔۔
مگر مقدر میں جو لکھا ہو
وہ کب مٹا ہے
سو گھر میں آیا
وجود میرا
ہوا اندھیرا
سنا ہے بیٹی تو رحمتوں
اور برکتوں کی نوید ہے پر
ہمارے گھر میں، یہ سب نہیں ہے
ہمارے گھر میں
تو بیٹیاں اک سوال ہیں
نشانِ حزن و ملال ہیں

سو میرے آنے پہ
کس لئے
کوئی مسکراتا
خوشی سے مجھ کو گلے لگاتا
کہیں سے کوئی مٹھائی آئی نہ پھول
سبھی کھلونوں کو بھول آئے
میں لعنتوں کی ملامتوں کی
تپش میں اتنی بڑی ہوئی ہوں
سڑک کنارے کھڑی ہوئی ہوں
تمہی بتاؤ۔۔۔
تمہی بتاؤ کہ میرا آخر قصور کیا ہے
یہ سارا قصہ حضور کیا ہے
میرا بھی جی چاہتا ہے میں بھی
سکول جاؤں
میرے بھی ہاتھوں میں ہوں کتابیں
میں اپنے مکتب کے سب بچوں سے ملکر
سبق سناؤں
جو گیت، نظمیں کتاب میں ہیں
وہ گنگناؤں
۔۔مگر یہ سب کچھ
کتاب، کاپی، قلم نہ کوئی دوات میری
ہے کتنی کمتر یہ ذات میری

تمہارے اتنے بڑے جہاں میں
کوئی کھلونا میرے لئے کیا نہیں بنا ہے
نہ کوئی گڑیا،
یہ شیر، بھالو
میرے لئے ہیں
غلیظ مٹی کے چند کھلونے
میں اپنے ہاتھوں سے خود بنا کر ہی کھیلتی ہوں
یہ دکھ بھی میں خود ہی جھیلتی ہوں
میرے بزرگوں نے جانے کتنی
دعائیں کی تھیں۔

کامران الفت (2007-09)

یونیورسٹی کا ایک بینچ

یونیورسٹی کا ایک بینچ
میرا دوست ہے
جب بھی تھک کے آتا ہوں
مجھے اپنی آغوش میں لے لیتا ہے
یونیورسٹی کا ایک بینچ

سرسبز درختوں کے سائے میں

مجھے چھپا لیتا ہے دھوپ کی کرنوں سے
چڑیوں کی چہچہاہٹ میں
گھاس کی سرسراہٹ لوری سی دیتی ہے
جیسے ماں بالوں میں ہاتھ پھیرتی ہے
یہ دوست انتظار کرتا ہے میرا
یونیورسٹی کا ایک بینچ

پریشان ہوتا ہوں جب بھی کسی روز
تو دوڑ کے چلا آتا ہوں
اس روز بھی جب ماں کی یاد آئی تھی
دل بھر آیا تھا، آنکھ برس پڑی تھی
مجھے یاد ہے، بہت رویا تھا میں
سسک سسک کے
کہ نہیں کوئی ٹھکانا، کہاں جاؤں آخر
مجھے نیند آئی تھی، جیسے صدیوں سے نہ سویا تھا
تب میں یہیں آیا تھا، اسی نے مجھے سلایا تھا
ہے میرا دوست
یونیورسٹی کا ایک بینچ

شب و روز گزر جاتے ہیں
اور سبھی چلے جاتے ہیں
بس یہی نہیں جاتا

میرا انتظار کرتا ہے

ہاں میرا دوست ہے

یونیورسٹی کا ایک بینچ

راجہ محمد شعیب (2008-10)

خود کلامی

تحفظ کی تصویر ہے کیسی؟

اندیشوں کی بھیڑ ہے کیسی؟

کیسا ہے وہ آنگن جس میں

دِھیرے دِھیرے

چلتے چلتے

پاؤں خون آلود ہوئے

خوابوں کا پیچھا کرنے میں

نیندوں سے بھی دُور ہوئے

اپنے پن کا سراب کیسا؟

عمرِ رواں کی اداس رُت کا ہر ایک لمحہ

نمود پاتے عذاب جیسا

جب سحر سے اندھیرا پُھوٹا

محبتوں کا طلسم ٹوٹا تو میں نے جانا

کہ میں نے خود کو

کیوں آنگن کا مکین جانا

بے سمتی ہی، مرا ساماں تھا
میرا قفس ہی، مرا جہاں تھا
سماج نے ہے مجھے بنایا
مقیم ایسا۔۔۔۔۔
جس کا کوئی
مکاں نہیں
جہاں کی بے انتہا وسعت میں
جس کا کوئی جہاں نہیں

محمد بابر حسین (2008-10)

''جان حیات''

چار بچوں کی انگلی تھامے
جب وہ
بکھری بکھری ، اجڑی اجڑی
ٹوٹے خواب، ادھورے جذبے
الجھے گیسو
نینوں سے بہتا کاجل لے کر
پت جھڑ کی تصویر بنی
بابل کی دہلیز پہ لوٹی
تو
بابل

انگنائی میں پاؤں دھرتے ہی
سب سے پہلے اس نے
خطوں کا وہ انبار نکالا
جس میں اس نے اس کو
''میری ملکہ''
''محل کی رانی''
''جان حیات'' لکھا تھا
اب وہ حیات تو ہے
پر وہ اس کی
جاں نہیں رہی
اس کی جاں کا درجہ
کوئی اور لے چکی ہے
وہ جھوٹے لفظ اسے ناگ کی مانند
ڈستے تھے
سو اس نے
وہ سب خط
جلا ڈالے ہیں

ڈاکٹر شاہدہ پروین
ادارہ علوم اسلامیہ جامعہ پنجاب لاہور

تیری آنکھیں

تیری آنکھوں کی اداسی یہ پتا دیتی ہے
تیرے اندر کوئی جنگ چھڑی رہتی ہے
دیکھ بول دے
دکھ اپنے کھول دے
تو کیوں بجھی بجھی سی رہتی ہے
یا پھر ایسا کر
اپنے دے کے سارے غم
میری لے لے خوشیاں تو

حسن رضا (11-2009)

لڑکی کا لمحہ

بے خبری میں جانے
کیسے کیسے لمحے آتے ہیں
جن کی خبر کی چُبھن سے
دِل میں
درد اُترنے لگتا ہے
کیوں ہوتی ہے زندگی میں
بے جادر اندازی سی
کیوں آتے ہیں خوش آنکھوں میں
خوف اندھیری راتوں کے
یہ لمحے زہر کی دعوت ہیں

جو سب کو کھانا پڑتی ہیں
سانسیں لینا پڑتی ہیں
زندہ رہنا پڑتا ہے
کیوں آتا ہے زندگی میں؟
کوئی لمحہ ایسا بھی
جس میں جسم کا ہر خُلیہ
موت تمنا کرتا ہے
جان زخم پہ پلتی ہے
آنکھ کرب میں جلتی ہے
افسوس۔۔۔۔۔۔!!
وہی اِک لمحہ ہے
جو کہ میرا اپنا ہے
بوجھ کبھی اُترا نہ اُس کا
میرے دلِ درماندہ سے
اور میں اُس کو رکھوں گی
اپنے پاس۔۔۔
بس اپنے پاس
کہ شاید
کوئی بے خبر شہزادہ
آ جائے میرے رستے میں
اور میں اپنا سنگدل لمحہ
سونپ دوں اُس شہزادے کو

کیونکہ اب میں تھک سی گئی ہوں
بوجھ سے قاتل لمحے کے
کاش!!!
کہ ایسا ہو جائے
اب وہ سمیٹے میرا لمحہ
جو جانے کب سونپ دیا تھا
وقت نے میری مُٹھی میں
اور میں اُسکی جیکٹ میں
آنکھیں موند کے سو جاؤں

محمد بابر حسین (2008-10)

ہم ایسے ہی ہیں

کسی کو کیا خبر
ہم کیسے ہیں
ہم ایسے ہی ہیں
جیسے جلا ہوا وجود
جیسے دکھا ہوا دل
جیسے تازہ زخم
جو ہوا سے بھی دکھ جائے
اور شبنم سے بھی۔۔!!

حادیہ نذیر (2008-10)

خواہش

مجھے تو تھی چاہ۔۔۔
کہ زندگی خوشیوں کے چراغ لیکر
میرے آنگن میں اترے
سحاب لہجوں کی بارش
گلاب چہروں کی سرخی
میرے من میں اترے
محبت خوشبو بن کر
چاہت رنگ میں ڈھل کر
حیات کے چمن میں اترے
مگر۔۔۔۔
خواہشیں حسرت ہوئیں
اداسی اور غم کے سرد موسم
میرے دامن میں اترے

صباحت فاروق (11-2009)

چھوٹی سی بات

چھوٹی سی بات
اے میرے ہمزاد!
اے میرے ہمزاد!!
کھوئے ہو کن سوچوں میں

کن سپنوں میں گم ہو تم
اور اداس ہو کاہے کو
رکھنا یاد ہمیشہ تم
بات یہ میری چھوٹی سی
وقت کا پہیہ رکتا نہیں
وقت بدلتا رہتا ہے
اچھا وقت جب آئے گا
تب حالات کی تلخی کو
اپنے ساتھ لے جائے گا

فائزہ خان (2009-11)

فلاں سے تھی غزل بہتر فلاں کی
فلاں کے زخم اچھے تھے فلاں سے
اقتباسات وانتخاب

شاعری سے انتخاب

کیمپس میں ایک شام

دن ڈھلتے جب شام ہوئی
نہر کنارا دھندلایا
سوچ کا گہرا سایہ سا
اک آواز نے چونکایا
''پار سڑک کے جانا ہے''
ساتھ میرے چلئے گا ذرا
STC تک جانا ہے
''آیئے'' میں نے ہولے سے
کہہ ڈالا تو ساتھ چلی
جیسے مجھ کو برسوں سے
وہ جانتی ہو۔ پہچانتی ہو۔
جانے اس نے پوچھا کیا
جانے میں نے بولا کیا
دو مبہم سی باتیں تھیں
میں تو اس کی سوچ میں تھا
شاید اپنی کھوج میں تھا
STC تک پہنچا تو
اس نے اپنی راہ لے لی

اور میں اپنی سوچ میں گم
اپنے کمرے میں آ کر
لیٹ رہا پر سویا نہ

حسن رضا

انتخاب: فہیم اختر (2008-10)

آج

بہت دنوں سے اک ملال رہتا تھا
سو۔۔۔۔
آج اُس کو تمام کرنا چاہتی ہوں
تمہاری چاہ میں کچھ ہو نہ سکا اِس دل سے
ہوتے ہوتے دھڑکن تمام ہو نکلی
حجاب سا تھا یا شاید تھی میری کمزوری
کہ!
دلِ ناتواں مچل مچل کے بھی
یقیں دِلا نہ سکا تم کو وفا شعاری کا
سو آج۔۔۔۔
میں نے اک فیصلہ کیا ہے کہ
تمہاری زیست کا ہر غم بڑے قرینے سے
پلک پلک سے میں چُن کر سنوار ڈالوں گی

اور پھر بڑے سکون سے لکھوں گی
میں اپنی ذات کی ہر اک خوشی کو تیرے نام
جو ہو سکے تو اب تو گِلہ مٹا ڈالو
کہ میرا آج۔۔۔۔
تیری ذات پر فدا ہو کر
ہمیشگی کی کسی عُمر میں بدل جائے

وقار مُنیر

انتخاب: مہرین علی (10-2008)

غزل

ہیں جو الجھے ہوئے دامن سے میرے خار سے کچھ
بات یہ ہے میری شناسائی ہے گلزار سے کچھ

رات چُپ چاپ جو کرتا رہا تاروں کو شمار
سو گیا آخرِ شب کہہ کے وہ دیوار سے کچھ

میر ی نظروں کا تقاضا ہے تیری نظروں سے
میر ے ہونٹوں کی طلب ہے تیرے رخسار سے کچھ

کیا گلستاں پہ گزری ہے بہار آنے سے
پوچھ لیتے ہیں چلو نرگسِ بیمار سے کچھ

تیرے فرماں پہ جو دارورسن پہ جھولا
سر وہ اونچا ہی ہوا تیری دستار سے کچھ

اور مفت میں صرف میں گھنگروں کی چھنک لایا ہوں
بخدا میں نے خریدا نہیں بازار سے کچھ

ہاتھ وہ جن میں لکیریں ہیں ہنر کی اظہر
وہ کبھی مانگنے اٹھتے نہیں سرکار سے کچھ

شاعر: اظہر مقصود

انتخاب: کنول مظفر شاہ (11-2009)

رقیب سے

آ کہ وابستہ ہیں اس حسن کی یادیں تجھ سے
جس نے اس دل کو پری خانہ بنا رکھا تھا
جس کی الفت میں بھلا رکھی تھی دنیا ہم نے
دہر کو دہر کا افسانہ بنا رکھا تھا
آشنا تیرے قدموں سے وہ راہیں جن پر
اس کی مدہوش جوانی نے عنایت کی ہے
کارواں گزرے ہیں جن سے اسی رعنائی کے
جس کی ان آنکھوں نے سو دعبادت کی ہے
تجھ سے کھیلی ہیں وہ محبوب ہوائیں جن میں

اس کے ملبوس کی افسردہ مہک باقی ہے
تجھ پہ بھی برسا ہے اس بام سے مہتاب کا نور
جس میں بیتی ہوئی راتوں کی کسک باقی ہے
تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی وہ رخسار وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے
تجھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوادی ہم نے
ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غم الفت کے
اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں
ہم نے اس عشق میں کیا کھویا کیا سیکھا ہے
جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں
عاجزی سیکھی غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرمان کے دکھ درد کے معنی سیکھے
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے رخ زرد کے معنی سیکھے
جب کہیں بیٹھ کے روتے وہ بیکس جن کے
اشک آنکھوں میں بلکتے ہوئے سو جاتے ہیں
ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب
بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں
جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں غریبوں کالہو بہتا ہے

آگ سی سینے میں رہ رہ کے ابلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

فیض احمد فیض

انتخاب: رانا تحسین خاں (11-2009)

بندھن

کتنا انوکھا ہے
یہ آنچل اور شملے کا بندھن
ایک سر بفلک اور ایک زمیں بوس
جو چلے تو۔۔۔۔۔
کھنچاؤ، تناؤ تو ہونا ہی ٹھہرا
بندھن، دلوں کا میل ہو اگر
آہن سے مضبوط تر
جنت سے حسین
بندھن بوجھ نہیں ہوتا
توازن ہو شرط اگر

پر
صنفِ نازک ہی کیوں؟؟
اس میزان کو تھامے ہوئے ہے

عظمیٰ بتول

انتخاب: ارم رباب (11-2009)

منتخب اقتباسات

رزق

جو ہماری جان کا محافظ ہے وہی ہمارے رزق کا بھی ضامن ہے۔رزق دینا رازق کا عمل ہے یہ اُس کا دعوٰی ہے جس نے سورج چاند ستاروں کو نورانی رزق عطا کیا ہے جس نے پہاڑوں کو استقامت دی ہے دریا کو روانی دی ہے۔گلوں میں رنگ بھرے ہیں موسموں کو خوئے انقلاب عطا کی ہے۔بیج کو مٹی کی تاریکی میں پالنے والا انسان کو کیوں نہ پالے گا۔

صبر واستقامت کا مقام ہے اپنی غریبی کی توہین نہیں کرنی چاہیے اپنے اعمال کو عذاب نہ بنایا جائے حق والے کو حق دیا جائے اور اپنی عاقبت کی فکر کی جائے ہر آنے والا لمحہ عاقبت ہوسکتا ہے۔

(واصف علی واصف)

انتخاب: حافظ منیر (10-2008)

عجیب بات

یہ ایک عجیب بات ہے کہ نیکی میں جتنی اکتاہٹ ہے بدی میں اتنی ہی رغبت ہے عالم عالم کو دیکھ کر سادھو، سادھو کو دیکھ کر جلتا ہے ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا مگر جواری جواری کو دیکھ کر شرابی شرابی کو دیکھ چور چور کو دیکھ کر ہمدردی جتا تا ہے ایک پنڈت جی اگر اندھیرے میں ٹھوکر کھا کر گر پڑیں تو دوسرے پنڈت جی انہیں اٹھانے کی بجائے دو ٹھوکریں اور لگائیں گے تاکہ وہ پھر اٹھ نہ سکیں مگر چور کو چور آفت میں دیکھ کر دوسرا اس کی آڑ لیتا ہے اس لیے بدوں میں باہمی محبت ہوتی ہے نیکی کی ساری دنیا تعریف کرتی ہے اس لیے نیکوں میں مخالفت ہوتی ہے۔

(منشی پریم چند)

انتخاب: سمیرا محمود (10-2008)

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے شیر کا

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

آگہی، دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

بس کہ ہوں غالبؔ! اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ میری زنجیر کا

مرزا اسد اللّٰہ خاں غالب

طرفہ صناع ہیں میر یہ موضوع طبعاں
بات جاتی ہے بگڑ تو بھی بنا لیتے ہیں

طنزومزاح

کچھ شہنشاہِ غزل کے بارے میں

اس لائن (ہمارے بھی اک روز ماں باپ تھے) کی خوبی یہ ہے کہ اس کے سات الفاظ، چار اجزائے ترکیبی پر مشتمل ہیں اور یہ چاروں ہی کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔اک روز ماں باپ تھے۔آپ کسی بھی جزو پر زور دے کر پڑھیں، بے کسی اور نحوست کا ایک نیا پرت ابھرے گا۔حد یہ کہ تنہا ''تھے'' بھی پوری لائن کے تاکیدی معنی، رخ اور لہجہ بدل کے رکھ دے گا۔تھے ے ے ے! ایسے چومکھے مصرے بڑے بڑے شاعروں کو نصیب نہیں ہوتے۔البتہ مہدی حسن اپنی گائیکی سے شعر کے جس لفظ کو چاہیں کلیدی بنا دیتے ہیں۔ان میں جہاں کئی ایک خوبیاں ہیں وہاں ایک بری عادت یہ پڑ گئی ہے کہ اکثر اپنی سخن فہمی کا ثبوت دینے کے لیے شعر کا کوئی سا لفظ جس پر انھیں کلیدی ہونے کا شبہ ہو جائے، پکڑ کے بیٹھ جاتے ہیں۔الاپ روک کے سامعین کو نوٹس دیتے ہیں کہ اب ذرا جگر تھام کے بیٹھو۔گنجینۂ معنی کا طلسم دکھاتا ہوں۔پھر آدھ گھنٹے تک اس لفظ کو جھنجھوڑتے ہیں۔اسے طرح طرح سے پٹخنیاں دے کر ثابت کرتے ہیں کہ سارا مفہوم اس ایک لفظ میں بند ہے۔باقی تمام الفاظ فقط طبلہ بجانے کے لیے ہیں۔یعنی صرف شعر کا وزن پورا کرنے اور ٹھیکا لگانے کے لیے۔مقصد یہ جتانا ہوتا ہے کہ میں شعر سمجھ کر ہی نہیں، سمجھا سمجھا کر گا رہا ہوں۔ان کی دیکھا دیکھی اوروں نے خود سمجھے بغیر ہی سمجھا سمجھا کے گانا شروع کر دیا ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ مہدی حسن کبھی اس لفظ کو کھدیڑتے ہوئے راگ اور غزل کی No-man's-land (نہ تیری نہ میری زمین) میں چھوڑ آتے ہیں۔اور کبھی ''کبڈی! کبڈی!'' کہتے ہوئے اسے اپنے پالے میں لے آتے ہیں۔پھر فری اسٹائل میں اس کے مختلف حصوں کو اپنی طاقت اور سامعین کی برداشت کی حد تک توڑتے، مروڑتے اور کھینچتے ہیں۔وہ بے دم ہو کے ست چھوڑ دے تو اسے پھپھیڑنے لگتے ہیں۔ابھی، لمبی سی گٹکری کے بعد، عجیب سا منھ بنائے، اسے پپول پپول کے دیکھ رہے تھے اور اپنی ہی لذت سے آنکھیں بند کیے ہوئے تھے۔ذرا دیر میں اس کی ہڈی تک چچوڑ کے طبلہ نواز کے سامنے پھینک دی کہ استاد، اب کچھ دیر جگل بندی ہو جائے۔کبھی حرفِ سادہ کے راگ انگ جی بھر کے جھنجھوڑنے کے بعد اس کی چھاتی پہ اپنے کڑھے ہوئے ریشمی کُرتے، زرین واسکٹ اور ہارمونیم سمیت چڑھ جاتے ہیں۔وہ اٹھنے کی کوشش کرتا ہے تو چوم چاٹ کے واپس لٹا دیتے ہیں:

چمٹے رہو سینے سے ابھی رات پڑی ہے۔

بالا آخر گھنٹوں رگیدنے کے بعد اسے تھپڑ مار کے چھوڑ دیتے ہیں کہ ''جا! اب کے چھوڑ دیا۔ آئندہ یاروں کے سامنے اس طرح نہ آئیو''

جس کو ہو دِین و دل عزیز مرے گلے میں آئے کیوں

مشتاق احمد یوسفی

انتخاب: ایم ساگر صغیر حسین (2009-11)

کیفے ٹیریا

آغاز پڑھائی ہے کیفے ٹیریا
غم کے ماروں کا ٹھکانہ ہے کیفے ٹیریا
چلو چلتے ہیں یونیورسٹی کیفے ٹیریا
جہاں مکھیوں کی افزائش ہے روز مسلسل
درو دیوار پہ ہے مچھروں کا بسیرا
چلو چلتے ہیں۔۔۔۔
سینڈوچ ہے دو دن پرانا
تازگی برگر کی ناپید ہے
کھاؤ پلیٹ بریانی کی سوکھی ہے نہ سلاد نہ کھیرا
چلو چلتے ہیں۔۔۔۔
شدت بھوک سے چاہتے ہیں چھٹکارا اہل علم
نجات کی ہے منزل آخری یہیں ہے ان کا بسیرا

چلو چلتے ہیں۔۔۔۔

دیدہ فرشِ راہ ہے۔ ہے آنے والیوں پہ نظر

دوست بیچارے تکتے ہیں کرئے ہم بھی صرف دولتِ ذخیرہ

چلو چلتے ہیں۔۔۔۔

ہو جیب خالی جن کی کریں گزارا ادھار پر

ورنہ لوٹتے ہیں دوستوں کو بن کے لیٹرا

چلو چلتے ہیں۔۔۔۔

قہقہوں کی گونج میں بوتلوں کے شور میں

لو گزر گیا دن ہو گیا اندھیرا

چلو چلتے ہیں۔۔۔۔

گر ہو جنگ کا سماں تو ہے صلح عظیم کا ضامن

عشق کی پینگیں بڑھتی جائیں جو ہو موسم البیلا

چلو چلتے ہیں۔۔۔۔

کرو ہر اک دن یاد کے پنجرے میں قید ثناء!

نہ یہ دن واپس آئیں گے نہ دوستوں کے سنگ سویرا

چلو چلتے ہیں۔۔۔۔

ثنا جاوید بٹ (2009-11)

اشتہار ضرورت رشتہ

ایک نوعمر سید زادہ، نیک چلن اور سادہ، سینہ کشادہ، لمبا کم پست زیادہ، گورا بدن، شیریں دہن، گھنگر یالے بال، آسودہ حال، لازوال، باکمال، بلند خیال، حسن کا دلدادہ، شادی پر آمادہ، ذات پات سے انکاری، اپنی سواری، خوبصورت جوان، اعلیٰ خاندان، عرصہ سے پریشان کے لئے ۔۔۔۔۔۔۔۔

ایک حسینہ کنواری، مثل حور، چشم مخمور، چہرہ پرنور، باتمیز اور باشعور، نشہءِ شباب میں چور، صوم وصلوٰۃ کی پابند، کم عمر وصحت مند، باہنر وسلیقہ مند، کم گفتار وباکردار، مکروفریب سے عاری، دیکھنے میں پیاری، باادب باحیاء، سراپا مہر و وفا، نہ شوقین سرخی وکریم، معمولی تعلیم، مہ جبین، بے حد حسین، پردہ نشین، راضی بہ عقد، بوٹا سا قد، آہستہ خرام، شائستہ کلام، پیارا سا نام جس میں ہو لام، عجوبہءِ کائنات، رفیقہءِ حیات درکار ہے۔ جس کے بغیر زندگی بے کار ہے!

مسہری یا چارپائی، روئی بھری رضائی، چند زیور طلائی، کچھ کرسیاں اور میز، بس اس قدر جہیز۔ لڑکا گو اناڑی ہے مگر کاروباری ہے۔ ایک چھوٹی سی دوکان، منہ میں زبان اور دل میں طوفان رکھتا ہے۔ مزید بات چیت بالمشافہ یا بذریعہ لفافہ۔ خط وکتابت پابندیءِ صیغہ راز ہے کہ یہی شریفوں کا انداز ہے!

انتخاب: حادیہ نذیر (2008-10)